حکیم محمد سعیدؔ

شب و روز

اپریل ۱۹۷۹ء

مع تاثراتِ سفرِ دمشق، حلب اور جدّہ

ہمدرد اکیڈمی

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، پاکستان، کراچی

حکیم محمد سعید

شب و روز

اپریل ۱۹۷۹ء

مع تاثراتِ سفرِ دمشق، حلب اور جدّہ

ہمدرد اکیڈمی
ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، پاکستان، کراچی

مولف .... حکیم محمد سعید

ناشر ...... ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، پاکستان، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

طابع زین پیکیجنگ انڈسٹریز، کراچی

اشاعت اوّل ۱۹۷۹ء

تعداد اشاعت .... دو ہزار

قیمت .... دس روپے

یکم اپریل ۱۹۷۹ء، اتوار

مارچ ۱۹۷۹ء کا مہینہ میری زندگی کا ایک اہم مہینہ تھا اور فروری ۱۹۷۹ کا مہینہ انقلابی اور ہنگامہ خیز۔ اور حیرت ہے کہ میں نے ان دونوں مہینوں کا روزنامچہ نہیں لکھا ہے۔ آج میں جب غور کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا ہے، اب تاثرات کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں کیسی بھی مصروفیت ہو روزنامچہ لکھ ہی لیتا ہوں۔ یہ دونوں مہینے میری طبی مصروفیات کے رہے ہیں، اور میں اپنی زندگی میں پہلی بار اندرونِ حکومت (اِن سائڈ گورنمنٹ) رہا ہوں اور یہ دونوں مہینے اس انوکھے تجربے کے تھے۔ اگر ایک یا دو دن کی فرصت کہیں مل گئی تو میں ان دونوں مہینوں کی واردات کو قلم بند کر ہی دوں گا۔ یہ دونوں مہینے واردات کے ہیں اور انوکھے تجربات کے!

والصّلح خیر

نمازِ تہجد کے بعد تلاوتِ قرآنِ پاک کے لیے قرآنِ حکیم کو کھولا۔ والصّلح خیرًا کی نوید ملی۔ درحقیقت صلح میری زندگی کا مشن ہے، میں نے اسی اصول پر عمل کیا ہے اور اب یہ ہدایت ملی ہے تو ضرور مجھے حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ مَیں اِن دنوں وزارتِ صحت میں اُلجھا ہُوا ہوں جہاں طب سے بالکل اور مسائلِ صحت سے قطعی ناواقفیت کی بنا پر حالات کو الجھایا جا رہا ہے۔ طب وصحت اور سیاست قطعی مختلف چیزیں ہیں۔ سیاسی طاقت طب وصحت کے مسائل کو حل نہیں کرسکتی اور نابالغ سیاست تو سمِ قاتل کا حکم رکھتی۔ وزارتِ صحت میں طب کے ساتھ جو کچھ سیاست کے عنوان پر ہو رہا ہے وہ سراسر غیر صحیح ہے اور اس فن میں جس امانت کی حاجت ہے اُس سے مختلف ہے۔ مَیں بہ حیثیت مشیرِ طب ان حالات سے دوچار ہوں اور آمادۂ جنگ ہوں! ایسے میں والصّلح خیر کی ہدایت ملی ہے!

آمنّا و صدقنا!

رات کو صرف چار گھنٹے سو سکا ہوں۔ شب گزشتہ سے پیوستہ بھی حال یہی تھا۔ دماغ کی طاقتیں (فیکلٹیز) بڑی تیز ہو چکی ہیں۔ آرام کر کے ان کو سُست کرنا ضروری ہے۔ میں جب کم نیند لیتا ہوں تو میرے قوائے دماغی حرکتِ مزید میں آجاتے ہیں۔ ان کو اعتدال پر لانے کے لیے ایک ذرا طویل نیند کی حاجت ہوا کرتی ہے۔ پونے چھ بجے مطب سے ٹیلے فون آیا کہ مریض آچکے ہیں۔ میں تو صبح چار بجے سے تحریری کام کر ہی رہا تھا۔ بس تیار ہو کر چھ بجے مطب پہنچ گیا اور ڈیڑھ بجے تک انتہائی سرعتِ فکر

اور سرعتِ رفتار کے ساتھ مریضوں کو طبی مشورے دیتا رہا۔ ۱۹۷ مریضوں کے درد کو میں نے سُنا اور اُن کی تکلیف کو رفع کرنے کی سعی کی، دلِ دردمند کے ساتھ۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے خدمت کے ایسے مواقع مجھے عطا فرمائے ہیں۔ ۲ بجے کراچی کے بین الاقوامی ہوائی میدان پر آگیا۔ میں نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ مجھے بہ حیثیت وزیرِ مملکت یہ سہولتیں حاصل ہیں کہ میں وی۔آئی۔پی راہ سے ہوائی جہاز میں جاؤں، مگر میں عام راہ سے آتا جاتا ہوں اور ان تمام مراحل سے خود کو گزارتا ہوں جن سے سب لوگ گزرتے ہیں مگر وزرا ان سے مستثنیٰ ہیں۔ کمرۂ انتظار میں کمال اظفر صاحب اور ہمارے مہمان مسٹر جیسپر گریفن (اوکسفرڈ یونی ورسٹی، انگلینڈ) موجود تھے۔ ان کے ساتھ باتیں کرنے کا وقت مل گیا۔ یہ میرے ساتھ اب پشاور جا رہے ہیں۔ جہاز نے ۵ بجے کے قریب پشاور پہنچا دیا۔ جہاز میں آج مسافر کم تھے، مجھے اطمینان سے کاموں کا موقع مل گیا اور ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کام میں صَرف ہو گئے۔ پشاور کے ہوائی میدان سے سیدھا مطب ہمدرد میں آگیا جہاں بہ کثرت مریض منتظر تھے۔ ہوائی میدان پر حکیم صادق انیس مل گئے۔ وہ حسبِ معمول مطب میں میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ برس ہا برس کام کرنے کے بعد مجھ سے جُدا ہو گئے ہیں اور ہمدرد سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ مگر آج اُن کا آنا مجھے بڑا پیارا لگا۔ مجھے اولاد کی طرح انیس سے محبت ہے۔ وہ جب گئے تھے تو دل ٹوٹ گیا تھا۔ آج پھر جُڑ گیا۔ نو بجے تک میں نے ۸۳ مریضوں کو طبی مشورے دیے۔ آج کے مریضوں کی کُل تعداد ۲۸۰ ہو گئی ہے۔

آج میرا قیام احسان قریشی کے ہاں ہے جو میرے بھانجے بھی ہیں اور ہمدرد کے زونل منیجر بھی۔ میں نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ بازار سے مزید کباب وغیرہ منگوا کر مسٹر گریفن کو بھی اپنے اور میرے ساتھ کھانے میں شریک کر لیں۔ اور ایسا ہی کر لیا گیا۔ ۹ بجے گریفن صاحب اور کمال اظفر صاحب کو عزیزمن جاوید حمید صاحب لے آئے اور ہم سب نے مل کر بڑا مزے دار کھانا کھایا۔ اس طرح تبادلِ خیال کا مزید موقع مل گیا۔ رات ساڑھے دس بجے مجلس برخاست ہوئی۔ میں نے نمازِ عشا ادا کی اور گیارہ بجے سو گیا، تاکہ آج کم از کم پانچ گھنٹے سو لوں کہ دماغ کو سکون حاصل ہو جائے اور اس کی برق رفتاری ختم ہو کر وہ حالتِ طبعی پر آجائے۔

مسٹر جیسپر گریفین

مسٹر جیسپر گریفین کا تعلق اوکسفرڈ یونی ورسٹی (انگلستان) سے ہے۔ وہاں وہ استاد کی حیثیت سے ہیں۔ کمال اظفر صاحب کے دوست ہیں اور ان کے ایما پر پاکستان آئے ہیں۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے دستِ تعاون دراز کیا ہے اور ایک عالم کی پوری قدر کی ہے اور اپنا مہمان بنا لیا ہے۔ وہ کراچی میں

ایک لیکچر دے چکے ہیں اور اب پشاور، راولپنڈی اور لاہور میں ایک ایک لیکچر دیں گے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۷۹ء کو وہ اپنے وطن روانہ ہو جائیں گے۔

۲- اپریل ۱۹۷۹ء، پیر، پشاور

صبح چار بجے بیدار ہو گیا۔ کئی گلاس پانی پی کر روزے کی نیت کر لی۔ پونے پانچ بجے تیار ہو کر نمازِ فجر ادا کر لی۔ موسم بہت ہی خوش گوار ہے۔ حکیم عبدالوحید صاحب نے کاغذات بھجوائے تھے، رات ہی کو ان کو دیکھ لیا تھا اب دوبارہ ان کو دیکھا اور ان پر ضروری نوٹ لکھے اور ہدایات دے دیں۔ "معاہدۂ طب" پر دستخط کر دیے ہیں اور آج اسے لاہور بھجوا دیا ہے۔ مشورہ یہ دیا ہے کہ اب اس معاہدے کی اشاعت کر دینی چاہیے۔ اس معاہدۂ طب کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ طب کو تسلیم کر لینے کے بعد پاکستان مڈیکل ایسوسی ایشن نے بڑا نامناسب اور بڑا غلط رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ طب کو سائنس تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے اور اطبا کو اتائی کہتی ہے۔ اس کو اس پر اصرار ہے کہ طب کو اسلامی نہ کہا جائے، مگر درحقیقت وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ پاکستان میں طب کو ختم کر دیا جائے۔ اس کو یہ ناگوار ہے کہ میں (حکیم محمد سعید) وفاقی وزارتِ صحت میں مشیرِ طب بن گیا۔ پاکستان مڈیکل ایسوسی ایشن کی ہر شاخ سے طب و اطبا کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں جب کہ میرا رویہ مصالحانہ ہے۔ میں نے ہمدرد صحت مارچ ۱۹۷۹ء میں بڑا مصالحانہ اداریہ لکھا ہے اور یہ رسالہ پاکستان مڈیکل ایسوسی ایشن کو بھجوا دیا ہے۔ بایں ہمہ ایسوسی ایشن کا رویہ غیر اخلاقی ہے اور ناقابلِ فہم۔ میں نے پاکستان طبی ایسوسی ایشن کو زیادہ مستعد کر دیا ہے اور اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ درجۂ الف کے غیر مستندین کو بھی حقوق دیے جائیں، میں ان کا تحفظ بھی چاہتا ہوں۔ معاہدۂ طب کی بنیاد یہ ہے۔

مُعاہدۂ طب

۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو میں نے جناب محترم حکیم محمد نبی خاں صاحب جمال سویدا کو زحمت دی تھی کہ وہ راولپنڈی میں مجھ سے تبادلِ خیال کے لیے وقت نکالیں۔ وہ اور اُن کے مُعاون جناب حکیم مرزا محمد یحییٰ صاحب اور جناب حکیم آفتاب احمد قرشی صاحب تشریف لائے تھے۔ ہمدرد ہاؤس، ویسٹ رِج میں یہ اہم ملاقات ہوئی۔ میں نے پشاور سے جناب حکیم عبدالوحید صاحب کو دعوتِ شرکت دی تھی۔ وہ تشریف لائے اور اس تبادلِ خیال میں شریک ہوتے۔ میں نے اس ملاقات میں رُو رعایت کے بغیر ان تمام غلطیوں کی نشان دہی کی کہ جو پاکستان طبی کانفرنس کی جانب سے گزشتہ دو ماہ میں ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے

وزیرِ صحت جناب صبغ صادق کھوسو صاحب نے ایسے فیصلے کیے جو ہرگز مفادِ طب میں نہیں ہیں اور نہ مفادِ صحت ہی میں ہیں۔ بارے تین گھنٹے بحث و تمحیص کے بعد ہم ایک نتیجے پر پہنچ گئے، اور ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء کی صبح ۴ بجے میں نے یہ تاریخی معاہدۂ طب قلم بند کر دیا جس پر ۲۳ مارچ کو ایک بجے دن دستخط ہو گئے۔

صبح ۶ بجے سے ۴ بجے شام تک ۱۹۷ مریضوں کو طبی مشورے دیے اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ تیار ہو کر ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل آ گیا جہاں پروفیسر گریفین مقیم ہیں اور یہاں آج ان کا لیکچر شامِ ہمدرد میں ہے۔ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ میں نے ان کا استقبال کیا اور پونے پانچ بجے لیکچر شروع کرا دیا۔ "رومن ایمپائر اینڈ برٹش ایمپائر اِن انگلش لٹریچر" گریفین صاحب کا موضوع تھا۔ ان کا لیکچر دل چسپ تھا اور پروفیسر بشیر صاحب (صدرِ مجلس) نے مسلم ایمپائر کا اضافہ کر کے بات کو زیادہ دل چسپ اور مکمل کر دیا۔ آج کی مجلس میں کوئی ڈیڑھ سو اہلِ علم جمع تھے جن کی موجودگی میرے لیے وجہِ تقویتِ قلب ہوئی ہے۔ پاکستان میں یہ وہ طبقہ ہے کہ جس سے ہر حکومت نے صرفِ نظر کیا ہے اور میں نے جس سے بڑا پیار کیا ہے۔ ابنِ خلدون نے کیا بات کہی تھی اور کس قدر سچ کہ جو معاشرہ علم و عالم کی قدر دانی نہیں کرتا وہ ترقیات سے محروم رہتا ہے۔ ہائے پاکستان کی یہ محرومیاں! کلیجا منھ کو آتا ہے!

ہوٹل کی یونین نے آج انتظامیہ کے خلاف یہ حرکت کی ہے کہ پاور اسٹیشن ساکت کر دیا ہے، لہٰذا ہوٹل میں تاریکی ہے۔ شامِ ہمدرد کی تقریب موم بتیوں کی روشنی میں ہوئی۔ "عوامی دَور" کا یہ سب سے دردناک تحفہ ہے کہ آجر اور اجیر اخلاق کو بھول گئے ہیں۔ اجیر نے آجر کو عاجز کر دیا ہے اور پاکستان کے معاشی و اقتصادی نظام کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں۔ میری رائے ہمیشہ سے یہی تھی کہ پاکستان میں یہ حالات پاکستان کو کم زور کر دینے کے لیے کیے جا رہے ہیں اور عوامی حکومت اپنے فکر و عمل میں ذرا بھی آزاد نہیں رہی ہے۔ میری یہ بات ایک دن ضرور ثابت ہو کر رہے گی کہ تقسیمِ پاکستان اور قیامِ بنگلہ دیش ایک سازش کا نتیجہ ہے۔

ان دنوں پورے ملک میں سراسیمگی اور خاموشی کی کیفیت ہے۔ پشاور میں اس کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا ہے۔ حالات میری رائے میں توجہ طلب ہیں۔ اب ہم طاغوت سے براہِ راست برسرِ پیکار ہیں۔ افغانستان اور پاکستان میں شدید قسم کی محاذ آرائی معنیٰ خیز ہے۔ یہ بات میں نے ستمبر ۱۹۷۸ء میں صاحبانِ خرد تک پہنچا دی تھی۔ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ طاغوت آمادۂ فساد ہے

اور اس کی قوت کا مظاہرہ افغانستان سے ہوگا اور شرارت کا مظاہرہ بلوچستان میں ہوگا۔

رات ساڑھے آٹھ بجے ہوائی جہاز اسلام آباد آگیا۔ مسٹر گریفین اور مسٹر کمال اظفر بھی ساتھ ہیں۔ ان کو ہوٹل چھوڑ دیا۔ کمال صاحب کو اسلام آباد پہنچا دیا۔ میں ویسٹ رج آگیا جہاں میں مقام ہمدرد میں مقیم ہوں۔ ناشتا تیار تھا۔ میں نے ناشتا کرلیا اور ساڑھے نو بجے بستر پر دراز ہوگیا۔

یہ گھر اب میری سرکاری قیام گاہ بھی ہے۔ مجھے حکومت کی عنایت سے اسلام آباد میں جو مکان ملا تھا وہ میں نے واپس کردیا ہے۔ میں اپنے اس کنجِ عافیت میں خوش ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کو دفتر میں بدل لیا ہے۔ پلنگ اس سے نکال دیا ہے۔ میز کرسی گھر کے سامان سے مرتب کرلی ہے۔ رات زمین پر اسی کمرے میں سو جاتا ہوں۔

۳ راپریل ۱۹۷۹ء، منگل، راولپنڈی

صبح چار بجے اٹھا، ترو تازہ تھا! الحمدللہ۔ کئی گلاس پانی نوشِ جان کرکے روزے کی نیت کرلی جلد تیار ہوا۔ نمازِ فجر ادا کی اور پانچ بجے صبح کہ اذانوں سے راولپنڈی شہر گونج رہا تھا میں مطبِ ہمدرد میں آگیا۔ آج میں نے پوری تازگی کے ساتھ اپنی دماغی قوتوں کو مرکوز کرلیا اور آغازِ مطب کردیا اور شام چار بجے تک مسلسل مطب کرتا رہا۔ تعداد مرضا ۳۷۵ سے اوپر ہوگئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں نے دو دن کا کام ایک دن میں ختم کرلیا۔

شامِ ہمدرد میں آج مسٹر گریفین کا لیکچر ہے۔ زمانۂ اوسط سے آج کے زمانۂ ٹیلے وژن تک! بڑا دل چسپ موضوع تھا۔ صدارت عزیزِ محترم جناب مسرت حسین زبیری صاحب نے کی تھی۔ تعارفِ موضوع میں نے کرایا تھا۔ کلماتِ تشکر جناب بریگیڈیئر گلزار احمد صاحب کے تھے۔ بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ اس باد و باراں میں مطبِ ہمدرد پر ذرا بھی اثر نہ پڑا مگر شامِ ہمدرد متاثر ہوئی۔ اس کی وجہ وہ مخصوص حالاتِ وطن بھی ہیں کہ جن سے آج ہر دل خوف زدہ نظر آتا ہے۔ تاہم پچاس سے زیادہ اہلِ علم موجود تھے۔ یونی ورسٹیوں کے اساتذہ بھی تھے۔ میری تقویتِ قلب کا پورا سامان تھا۔

ایک لاکھ درود شریف

آج ایک معمر مریض نے ایک لاکھ درود شریف کا ہدیہ عطا فرمایا۔ دل بڑا ہی متاثر ہوا۔ فرماتے تھے کہ ایک ہفتے قبل آپ کا خیال آیا اور بے اختیار دل چاہا کہ آپ کو کوئی نذرانہ دوں۔ بس میں نے ایک لاکھ بار درود شریف پڑھا اور یہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ دل جذباتِ مسرت و امتنان سے مملو ہوگیا۔ کیسی محبت لوگ مجھ سے کرتے ہیں۔ سجدۂ شکر بجالایا۔ الحمدللہ علیٰ احسانہ۔

میری وزارت سے کاغذات آئے تھے۔ آج میں نے نمازِ مغرب کے بعد ان کو دیکھا اور ضروری ہدایات دے دیں۔ اس کے بعد طبیہ کالجوں کی جائزہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ طے یہ پایا کہ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر پاکستان کے طبیہ کالجوں کا دورہ ملتوی کردیا جائے اور کم ازکم دس دن کے بعد حالات کا جائزہ لے کر کام کا آغاز کیا جائے۔ ساڑھے آٹھ بجے کام ختم ہوا۔

میں نے اِس کمیٹی کی میٹنگ میں بادلِ ناخواستہ شرکت کی ہے۔ اس کمیٹی کی رکنیت میں ایسے دوست شریک ہیں کہ جن کے دل صاف نہیں ہیں اور جو میرے خلاف غلط اندازمیں لکھتے رہے ہیں، مگر میں نے ان کا احترام کیا اور اُن کے ساتھ تعاون کیا ہے۔

میں نے لندن میں ایک دماغی اعتبار سے معذور بچی کو دیکھا تھا۔ وہ اب یہاں ہے۔ آج اس کے حالات پر ازسرِنو غور کیا اور نو بجے تک تمام کیس سمجھ کر مناسب ادویہ تجویز کردیں۔ نو بجے مسٹر گریفین سے رابطہ قائم کیا' مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ ان کو نوٹ لکھ دیا اور خدا حافظ کہہ دیا اور ہوائی میدان آگیا۔ یہاں چند مریض تھے۔ ان کو طبی مشورہ دیتا ہوا جہاز میں سوار ہوگیا اور کراچی روانہ ہوگیا۔

۴-اپریل ۱۹۷۹، کراچی، دمشق (شام)

کراچی وارد ہوا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نئی تاریخ شروع ہوچکی تھی۔ گھر آیا تو ہمشیرِ محترم محمودہ بیگم اور ان کی معذور بچی اور میری بھانجی ثریا ہمدرد منتظر تھیں کہ ملاقات کرکے وہ سوئیں گی۔ دل بھر آیا۔ ثریا کی معذوری سے دل بڑا دکھتا ہے۔

میں دورۂ پشاور/ پنڈی سے قبل کراچی سے روانہ ہوتے ہوتے سامان باندھ چکا تھا۔ اب ایک بجے شب میں نے اپنے کاغذات اور فائل دیکھے۔ دو بجے تک تمام کام صاف کیے اور ایک گھنٹہ آرام کے لیے لیٹ گیا۔ ساڑھے تین بجے اُٹھ گیا۔ سامان کو درست کیا، فائل دیکھے، مقالات کو پیک کیا اور جناب حامد حسین صاحب کے ہاتھ سامان ہوائی میدان بھجوادیا۔ خود تیار ہوگیا اور پانچ بجے ہوائی میدان آگیا۔ گھر سے ہوائی میدان تک میری اہلیہ اور میری بیٹی سعدیہ راشد مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ عام طور پر میرے رفقائے کار بھی بیرونِ ملک روانگی اور وہاں سے واپسی کے موقع پر ہوائی اڈے آتے ہیں، لیکن مجھے ان کی زحمت سے تکلیف ہوتی ہے۔ غنیمت ہے کہ آج انھوں نے میری بات مان لی۔ ہوائی میدان آیا تو جہاز تیار تھا۔ برادرِ عزیز ڈاکٹر محمد الیاس موجود تھے۔ ان سے رخصت ہوا۔ موٹر ڈرائیوروں سے شیک ہینڈ کیا۔ کسٹم سے گزر کر جہاز میں سوار ہوگیا۔ اور اب یہ نوٹ پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز کے طیارے میں لکھ رہا ہوں۔ یہ طیارہ مجھے دمشق لے جارہا ہے جہاں سے میں حلب جاؤں گا، وہاں کل سے

دوسرا بین الاقوامی سمپوزیم تاریخ سائنسِ عربی شروع ہو رہا ہے اور میں اِس میں شرکت کروں گا۔

دمشق کے ہوائی میدان پر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کا طیارہ سات بج کر بیس منٹ پر اترا۔ پاکستان اور شام کے درمیان تین گھنٹوں کا فرق ہے۔ پاکستان میں اس وقت دس بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں بہ خیریت تمام منزلِ مقصود تک پہنچ گیا ہوں۔ اور ایک شکر اس لیے بھی کہ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے افسرِ تشریفات کے سوالات سے نجات ملی۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں اس وقت عصبی تناؤ میں ہوں۔ مجھے پاکستان میں صورتِ حال کا صحیح علم ہے۔ دوسرے میں نے کل پانچ بجے سے مطب شروع کیا جو گیارہ گھنٹے جاری رہا۔ پھر شامِ ہمدرد میں تقریر کی۔ پھر طبیہ کالجوں کی جائزہ کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی۔ اس کے بعد راولپنڈی تا کراچی سفر۔ اس سفر میں تمام دفتری ہدایات لکھنے کا کام کیا۔ گھر آکر فائلوں کو دیکھنا اور ضروری نوٹ لکھنا اور صبح چار بجے سے سفر کی تیاری۔ اس پر مستزاد بھٹو صاحب کی پھانسی جس کے بارے میں لوگوں کے سوالات کے جوابات اور پھر اس کے بعد جو حالات درپیش ہونے ہیں اُن کا اعصاب پر زبردست تناؤ ہے۔ اس تناؤ کی شدید کیفیت میں کسی کی نامعقول گفت گو از حد تکلیف دہ ہوتی ہے۔

دمشق کے ہوائی میدان پر "الندوۃ العالمیۃ الثانیۃ لتاریخ العلوم عند العرب" کی جانب سے استقبال کا انتظام تھا۔ جہاز کے پاس ایک صاحب "بینر" لیے کھڑے تھے۔ میں اُن کے قریب چلا گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ میں "ڈاکٹر حکیم" ہوں۔ ان کو کسی ایک اور مندوب کا انتظار تھا، مگر وہ اس جہاز میں نہ تھے۔ ان بزرگ کی زبان عربی ہے یا وہ فرانسیسی جانتے ہیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے حضرات بڑے اخلاص سے پیش آئے اور ان کی جانب سے جہاز میں اور گراؤنڈ پر پذیرائی میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں اس دوگونہ استقبال سے سارے مراحل سے منٹوں میں گزر گیا اور ایک شان دار موٹر کار کے ذریعہ سے مجھے شہر روانہ کر دیا گیا جہاں ایک ہوٹل میں قیام کا انتظام ہے۔

ہوائی جہاز جب اتر رہا تھا تو دمشق کے دیہات پر نگاہ پڑی۔ سینکڑوں مکانات کھیتوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ اکثر سادہ اور دیہات کے مکانوں کی طرح مٹی سے لیپے ہوئے۔ متعدد کا رنگ فیروزی ہے۔ ایک مکان کا رنگ سرخ نظر آیا۔ اِس سے مجھے اِشتراکیت کی بُو آئی۔ اسی ماہ مارچ کی پہلی تاریخوں میں صدرِ شام جناب حافظ الاسد خاموشی سے روس کا دَورہ کر آئے ہیں۔ عراق سے شام کے تعلقات میں یگانگت قدیم روایات کی عکاسی ہے، نہ عربیت اور نہ اسلام اس کا سبب ہے، بلکہ یہ میل ملاپ اشتراکی ہے۔ میں یہ غور کرتا رہا کہ اس وقت شرق الاوسط میں بارہ عرب ممالک دُو گروپوں میں عملاً تقسیم ہو گئے ہیں: ایک گروپ امریکی ہے اور دوسرے کا تعلق رُوس سے ہے اور یہ عرب ممالک عملاً ایک دوسرے کے

مدِ مقابل ہو گئے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے اتحاد بین المسلمین کی جو تحریک زور پر آگئی تھی آج وہ عملاً پارہ پارہ ہو چکی ہے اور دنیائے عرب آج انتہائی انتشار کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ بایں ہمہ وہ اسرائیل سے نبرد آزما ہونے کی مدّعی ہے، مگر جو حالات ہیں وہ ان کے ضعف ہی پر منتج ہو سکتے ہیں۔ اسرائیل کے لیے جو ہتھیار درکار ہے وہ صرف ایک ہے اور وہ ہے اتحاد بین العرب۔ اگر یہ میسر نہیں ہے تو اسرائیل پر فتح کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حال تو یہ ہے کہ آج دُنیائے عرب کے استحکام کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ دنیائے عرب کی ساری دولت کہ جو دُنیائے عرب اور عالمِ اسلام کے استحکام پر صرف ہونی چاہیے تھی اور یہ طاقت اور توانائی تبلیغِ اسلام پر خرچ ہونی چاہیے تھی وہ اب ایسے کاموں میں لگ رہی ہے کہ جس سے تقویتِ اسلام کا مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔ طاغوتی طاقتیں اپنے مشن میں کامیاب ہوتی نظر آرہی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں دنیائے عرب نے اپنے اثرات و نفوذ سے دنیا میں جس تحریکِ اسلام کو جنم دے دیا تھا اس کی عمر اس درجہ قصیر رہی کہ آج حیرت ہوتی ہے اور دُکھ ہوتا ہے۔ آج ہم مغرب میں جو شور سُنتے ہیں کہ اسلام پھیل رہا ہے وہ درحقیقت واویلا ہے۔ مغرب کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ مغرب میں اسلام کے نفوذ پر بندھ باندھا جا چکا ہے اور عرب طاقت کو شل کر دیا گیا ہے اور مُسلم قوت کو ضعیف کیا جا چکا ہے۔

ہوٹل کی منتظمہ افراتفری کے عالم میں تھی۔ سمپوزیم کی منتظمہ کا حال بھی زیادہ اچھا نہ تھا۔ ہوائی میدان پر مجھ سے کہا گیا کہ کل صبح چار بجے حلب روانگی ہے۔ ہوٹل میں کہا گیا کہ تین بجے شام کو تیار رہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک گروپ اب نو بجے صبح جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے بھجوا دیجیے یہ بھی تو ممکن تھا! ڈاکٹر سہیلہ الجبوری عراق سے آئی ہوئی ہیں اور وہ کسی دوسرے ہوٹل میں ہیں۔ ان سے رابطہ ضروری تھا اس لیے کہ ان کو میرا انتظار ہے۔ یہ رابطہ ایک گھنٹے تک قائم نہ ہو سکا۔ ٹیلی فون کے لیے یہ شرط تھی کہ مَیں اپنے کمرے میں جا کر رابطہ قائم کروں اور میں کمرہ استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا اور ڈاکٹر سہیلہ سے رابطہ قائم کر کے اب فوراً حلب روانہ ہونا چاہتا تھا۔ انتہائی جدّ و جہد کے باوجود ٹیلی فون نہ مل سکا اور نو بجے والا گروپ روانہ ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں گیا تو یہاں بڑا عجیب منظر دیکھا۔ نہ جانے صبح کس گروپ نے یہ کمرہ خالی کیا ہے۔ ہر شے پریشان ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید اس کمرے میں تین بچے ٹھہرے تھے جنھوں نے روانہ ہوتے وقت کمرے کی ہر چیز تتر بتر کر دی ہے۔ میں اس کمرے کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے وضو کیا اور اُلٹے پاؤں نیچے واپس آگیا۔ منتظمین سے کہا کہ مجھے کمرے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تین بجے تک لاؤنج میں انتظار کرنا پسند کر لوں گا۔ ان کے اصرار پر میں نے بتا دیا کہ کمرہ نہایت گندہ ہے اور

میں اس گندگی سے زیادہ اچھا اسے سمجھتا ہوں کہ ہوٹل کے آرام دہ لاؤنج میں وقت گزار دُوں۔ ان کا اصرار رہا کہ میں کمرہ استعمال کروں، مگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہا اور کمرے میں پھر نہیں گیا۔

ایک گھنٹے کی جدّوجہد کے بعد بالآخر ڈاکٹر سہیلہ الجبوری سے رابطہ قائم ہوگیا۔ طے پایا کہ ساڑھے بارہ بجے وہ یہاں آجائیں گی۔ ہم کھانا ساتھ کھائیں گے اور پھر تین بجے والے گروپ کے ساتھ حلب چلیں گے۔

جو گروپ نو بجے چلا گیا اُس میں کئی پُرانے دوست تھے: پروفیسر راجر آرنالدیز (پیرس)، پروفیسر ولید عرفات (گلاسگو)، ڈاکٹر جانسٹن (مانچسٹر) وغیرہ وغیرہ۔ بارے جو لوگ یہاں ہیں اُن سے دُنیا میں کہیں نہ کہیں ملاقات رہی ہے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایران کے پروفیسر مہدی محقق اور ان کی اہلیہ نوشین خانم وارد ہوئیں۔ ان کے ساتھ پروفیسر ہمدانی بھی تھے اور اُن کی اہلیہ بھی۔ انقلابِ ایران کے بعد پہلے ایرانی یہ ہیں جن سے ملاقات ہوئی ہے۔ محقق میرے پیارے دوست ہیں۔ پاکستان میں ہمدرد کے مہمان رہے ہیں۔ میں بھی تہران میں اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ ان کا فیصلہ بھی یہی رہا کہ تین بجے حلب روانہ ہوں گے۔ مسز محقق خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ ان کی رائے ہوئی کہ حضرت زینبؓ کے مزار پر چلنا چاہیے اور انھوں نے اس کا انتظام کرلیا۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ میں اس سے قبل بھی یہاں حاضر ہوچکا ہوں۔ مزارِ مبارک پر اِطمینان سے بیٹھ کر میں نے فاتحہ خوانی کی اور اس ہجوم اور آہ و بکاہ سے بے نیاز ہوگیا کہ جو یہاں کا معمول ہے۔ ایک پارہ قرآن پڑھا۔ بڑا قلبی اطمینان ہوا۔ ان دوستانِ ایرانی کے حق میں دُعا کی کہ ان کی وجہ سے مجھے یہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم ایران کے اُن لوگوں میں شمار ہوتے ہیں کہ جو قرآن کو آج کی زبان میں سمجھتے ہیں اور ایرانیوں کو سمجھانے کے جرم میں ملک بدر ہوئے۔ انگلستان میں اپنی جان جانِ آفریں کے سُپرد کی۔ نعش شہنشاہِ ایران نے آنے نہ دی۔ یہاں مقامِ زینب میں دفن ہوئے۔ میں ان ایرانی دوستوں کے ساتھ ڈاکٹر شریعتی کے مزار پر بھی گیا۔ فاتحہ خوانی کی۔ یہاں شہنشاہِ ایران کے خلاف وہی جُملے لکھے دیکھے کہ جو لندن میں جگہ جگہ دیکھے تھے۔ اب آیت اللہ رُوح اللہ خمینی صاحب کے حق میں کلماتِ خیر لکھے جاتے ہیں۔

ہوٹل واپس آیا۔ ڈاکٹر رشدی راشد سے ملاقات ہوئی۔ مصر نے یہ ایک بڑا عالم پیدا کیا ہے کہ جو نہ جانے کن حالات میں مصر چھوڑ کر فرانس میں رہتا ہے۔ میں ان سے بڑا متاثر رہا ہوں۔ آج اُن سے ذرا اطمینان سے باتوں کا موقع مل گیا اور کچھ دیر علمی گفت گو ہوئی۔ اہلِ علم سے باتیں کرنے سے جہاں علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں ذہن کی گرہیں کھُلتی ہیں اور روشنی ملتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بعض نکتے کتابوں کے مطالعے سے اس خوبی سے حل نہیں ہوتے جس خوبی اور سہولت سے اہلِ علم کی گفت گو اور تبادلِ خیال میں نکاتِ علمی واضح

ہو جاتے ہیں ۔ ایک بجے ڈاکٹر سہیلہ الجبوری آگئیں ۔ وہ اپنے کسی عزیز اور اپنے شوہر سلمان الرادی کے انجنیئر دوست ڈاکٹر ہشام اور اُن کی اہلیہ کے ساتھ تھیں ۔ میں ان کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گیا ۔ مسز ہشام موٹر چلا رہی تھیں ۔ ہم چاروں دمشق کے ہوٹل شیراتون گئے ۔ باہر سے اس کا ڈزائن ایسا ہے کہ جیسے کوئی پہاڑی ہو ۔ پہاڑوں کے درمیان یہ اونچی پہاڑی بھلی لگتی ہے ۔ اندر جا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اس ہوٹل کی آرائش اور زینت پر کیا کچھ خرچ نہیں ہوا ہے ۔ دُنیائے عرب میں ، بلکہ دنیائے اسلام میں یہ مغربی اور امریکی ہوٹلوں کی بھرمار معنی خیز ہے ۔ یہ فقط اس لیے نہیں ہے کہ مغرب ان ہوٹلوں سے بے اندازہ دولت کما کر لے جاتا ہے ، بلکہ یہ مقامات دنیائے اسلام میں تہذیبِ مغربی کی تبلیغ کے ہیں ۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح ایسے شہروں میں چینی ریسٹوران ہوتے ہیں اور اثر و نفوذ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔

اگر مجھے یہ اندازہ ہو جاتا کہ ڈاکٹر سہیلہ الجبوری یہاں مجھے لنچ دیں گی تو میں یہاں آنے کو ہرگز تیار نہ ہوتا ۔ یہاں آکر بھی میں نے اصرار کیا کہ ہم لنچ ہال کے بجائے کیفے ٹیریا چلیں جہاں ہلکی چیزیں مل جائیں گی ۔ مگر ایسا نہ ہوا اور مجھے بادلِ ناخواستہ یہاں کا لنچ کھانا پڑا ۔ ظاہر ہے کہ اس کا بل دس امریکی ڈالر فی کس سے کم تو نہ ہوگا ۔ بڑا دُکھ ہوا ۔ مرغی اپنی جان سے گئی میاں کو مزا نہ آیا !

انجنیئر ہشام صاحب سے بھی باتیں ہوئیں ۔ وہ بڑے خوش حال ہیں ۔ اچھے سیّاح ہیں ۔ ان کی اہلیہ مظہرِ امارت ہیں ۔ بارے تین بجے کے قریب ہشام اور بیگم ہشام نے مجھے اور ڈاکٹر سہیلہ کو ہوٹل چھوڑ دیا اور ہم دونوں اُس بس میں سوار ہو گئے کہ جس میں سمپوزیم کے دوسرے علما سوار ہو رہے تھے ۔ اس گروپ میں آدھے سے زیادہ میرے جاننے والے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ بس سے راستہ کوئی پانچ گھنٹے کا ہے ۔ زیادہ بھی ہو سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آٹھ سو کلومیٹر سفر بس میں ہوگا ۔ اس حساب سے تو یہ اچھا ہے کہ ملک شام کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملے گا ۔ مگر یہ سفر کم تکلیف دہ نہیں ہو سکتا !

حمص

راستے میں حمص آیا ۔ سوال اٹھا کہ ٹھیریں یا چلتے رہیں ۔ تقریباً چار گھنٹے سفر طے ہو چکا تھا ۔ میری رائے تھی کہ پندرہ منٹ آرام کے لیے باہر اتر کر چلنا پھرنا چاہیے ۔ میں چاہتا تھا کہ بس حضرت خالد بن ولیدؓ کے مزارِ اقدس کے قریب روکی جائے ، مگر اس سے شاید کسی ایک کو بھی دل چسپی نہ تھی ۔ بس عین بازار میں کھڑی ہوئی ۔ اتنے میں مغرب کی اذان کی آواز آئی ۔ ڈاکٹر دفاع اور ڈاکٹر ناصر نے کہا ، " حکیم صاحب ! نمازِ مغرب باجماعت ادا کرنی چاہیے ۔ مسجد کا راستہ مل گیا اور ہم نے باجماعت نمازِ مغرب ادا کر لی ۔ مسجد کا

نام جامع الخالد تھا۔ نمازیوں کی تعداد کم نہ تھی۔ نماز ادا کر کے دل کا بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ڈاکٹر دفاع جامعۃ ظہران (سعودی عرب) میں پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر ناصر کلیہ شریعتہ، جامعۃ ملک عبدالعزیز میں صدر ہیں۔ دونوں میرے پُرانے دوست ہیں۔ ڈاکٹر دفاع تو کراچی میں میرے ساتھ رہ بھی چکے ہیں۔ ریاضیات پر ان کی ایک قابلِ تعریف تصنیف ہے۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے نمازِ مغرب با جماعت مل گئی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ

حضرت خالد بن ولیدؓ کا شجرۂ نسب بہت طویل ہے۔ وہ مختصراً خالد بن الولید بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی کہلاتے تھے۔ ان کی کنیت ابو سلیمان تھی۔ وہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مقرب جلیل القدر صحابی، لشکرِ اسلام کے عظیم سپہ سالار اور فاتح تسلیم کیے جاتے ہیں، لیکن عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت وہ خاندانِ قریش کے اُن لوگوں میں شامل تھے جن کو شارعِ اسلام اور دینِ متین سے سخت عداوت اور دشمنی تھی اور جو اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ اس شمعِ فروزاں کو اپنی سازشوں اور اپنی معاندانہ عملی سرگرمیوں سے بُجھا دیں جسے محبوبِ الٰہیؐ نے روشن کیا تھا۔

انھوں نے جنگِ اُحد میں لشکرِ اسلام کے خلاف اپنے عسکری تدبر کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کی ذراسی غلطی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کامرانی حاصل کرلی۔ اسی طرح غزوۂ خندق کے وقت بھی انھوں نے کفار کی طرف سے فوجی دستے کی قیادت کی اور اس دوران میں عمرو بن العاص کے ساتھ مل کر سخت نقصان پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ اور اخلاقِ جمیلہ سے یہ دونوں اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی راہِ مخاصمت ترک کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور وہ کارنامے انجام دیے جن کو تاریخ میں سونے کے حروف میں لکھا جاسکتا ہے۔

حضرت خالدؓ ایک نہایت ہی خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ اور اپنے دس بھائیوں میں سب سے زیادہ ممتاز انسان تھے۔ انھوں نے ناز و نعمت کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود علومِ ظاہری و باطنی اور فنِ حرب میں کمال حاصل کرلیا اور نہ صرف اپنے خاندان بلکہ سارے قبیلے میں مشہور ہو گئے تھے۔ سب لوگوں نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ جب تک خالد ہمارے درمیان ہے، کوئی دشمن ہمارا بال بیکا نہیں کرسکتا، البتہ ان کے قبولِ اسلام کے بعد بعض اہلِ خانہ اور بیشتر اربابِ قبیلہ ان کی طرف سے مایوس ہو کر علاحدگی اختیار کرنے لگے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے صلح حدیبیہ کے بعد ۸ ہجری میں خود آنحضرتؐ کی

خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد سب سے پہلے آپ سریہ موتہ میں شریک ہوئے۔ اس جنگ میں اسلامی لشکر کے تین سپہ سالار حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے کمان سنبھالی اور اپنے فوجی تدبر اور مہارت سے مسلمان لشکر کو دشمن کے نرغے سے بچا لائے۔ اس جنگ میں آپ کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں اور آنحضرت صلعم نے آپ کو سیف اللہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

اگرچہ فتح مکہ میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، لیکن آنحضرتؐ نے افواج کو منظم کر رکھا تھا اور حضرت خالد بن ولیدؓ میمنہ کے کمانڈر تھے۔ اس کے بعد حضورِ اکرمؐ نے آپ کو سریہ نخلہ کا قائد بنا کر بھیجا۔ یہاں آپ نے عرب کے مشہور بُت عُزیٰ کو توڑا۔ آپ غزوۂ حنین اور تبوک میں بھی شریک ہوئے اور سریہ نجران کی قیادت بھی کی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول کے دورِ خلافت میں آپ کو جھوٹے نبیوں اور مُرتدین اور زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ آپ نے جھوٹے نبی طلیحہ اور مسیلمہ کذاب کو شکست دی اور مُرتدین و منکرین کو مطیع کیا۔ انھی دنوں عراق کی سرحد پر جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کو لشکر دے کر عراق بھیجا۔ آپ نے وہاں جا کر سب سے پہلے ابلہ میں ایرانی جرنیل ہرمز کو شکست دی۔ اس کے بعد مذار، ولجہ، اُلیس کے معرکوں اور حیرہ میں شان دار کامیابی حاصل کی۔ ایرانی فوجوں نے جب شمالی عراق میں دفاع قائم کر لیا تو آپ نے انبار اور عین التمر کو فتح کیا۔ عراق و شام کی سرحد پر واقع مقام دومتہ الجندل میں عربی عیسائی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ خلیفۂ اول کے فرمان کے مُطابق آپ اُن کی مدد کو وہاں پہنچے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کئی اور معرکوں کے بعد آپ فراض پہنچے جہاں عراق اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں اور ایرانیوں، رومیوں اور عرب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اس معرکے میں آپ نے دشمن کو شکستِ فاش دی۔ خفیہ طور پر حج کو گئے اور اس تیزی سے واپس لوٹے کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کے بے مثل تدبر سے قلیل عرصے میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ انھی دنوں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام میں مسلمانوں کے لشکر بھیج رکھے تھے۔ رومی ان کی سخت مزاحمت کر رہے تھے، چناں چہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خالد بن ولیدؓ کو حکم دیا کہ وہ شام پہنچ کر مسلمان لشکروں کی مدد کریں۔ ۱۵۰۰ میل کا طویل بے آب و گیاہ صحرا کا راستہ طے کر کے آپ پہلے بُصریٰ پہنچے۔ یہاں حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کی مدد کی اور بُصریٰ کو مطیع بنایا۔

اس کے بعد آپ اجنادین میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد کو پہنچے اور رُومیوں کو شکست دی۔ پھر

حضرت ابو عبیدہؓ کے ساتھ مل کر دمشق پر حملہ آور ہوئے۔ محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات ہوئی اور حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم بنے۔

تین ماہ کے محاصرے کے بعد آپ ایک دن شہر کے ایک طرف والے دروازے پر قابض ہو گئے، لیکن اہلِ دمشق نے دوسرے حصے میں حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کی درخواست کی۔ اِس طرح دمشق پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ بے درپے شکستوں کے بعد رُومی یرموک کے مقام پر ایک عظیم لشکر لے کر جمع ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے مسلمانوں کے لشکر کو مرتب کیا۔ یہاں بڑی خوں ریز اور فیصلہ کُن جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور رُومیوں کی طاقت ختم ہو گئی۔

دین سے آپ کے دلی لگاؤ کا بھی یہ عالم تھا کہ الفراض کی فتح کے بعد جب آپ کو خیال آیا کہ وہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے تو اپنے افرادِ لشکر کو بتائے بغیر برق رفتاری کے ساتھ ارضِ پاک کا رُخ کیا اور فریضۂ حج ادا کر کے فوراً لوٹ آئے۔ آپ لڑائیوں اور معرکوں کے دوران میں نماز اور روزے کی بھی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ آپ نے ادائے فرض میں کبھی کوتاہی یا غفلت نہیں برتی، نیز اپنے ماتحتوں اور ساتھیوں کو ارکانِ اسلام کی پابندی کرنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہتے تھے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ شکل و صورت، قد و قامت، عادات و خصائل اور نظریات و خیالات کے اعتبار سے حضرت عمر فاروقؓ سے بہت قریب تھے اور چوں کہ لڑکپن اور عہدِ جوانی میں ایک ساتھ کُشتی لڑتے، تیر اندازی کرتے اور فنِ حرب سیکھتے تھے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی آپ میں بڑی مماثلت تھی اور بعض لوگوں کو کبھی کبھی آپ کو پہچاننے میں مغالطہ ہو جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد مانوس بھی تھے۔

ان سب باتوں کے باوجود ایک وقت آیا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت خالدؓ کو اُن کے منصب جلیلہ سے سُبک دوش کر دیا، لیکن اللہ کے اس مقرب بندے کو ذرا بھی ملال یا اعتراض نہیں ہوا۔ خندہ پیشانی کے ساتھ حکم کو قبول کر لیا۔ اپنے اختیارات حضرت ابو عبیدہؓ کے سپرد کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت میں انھی کے ماتحت کچھ دن رہے۔ ان کی برطرفی کے دو سبب تھے؛ اول یہ کہ حضرت خالدؓ نے ایک شخص مالک بن نویرۃ الیربوعی کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اُس نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، لیکن اس کا یہ جرم سزائے قتل کا مستوجب نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر لڑائی میں کام یابی پر لوگ حضرت خالدؓ کو مستحقِ مبارک باد ٹھیراتے تھے، لیکن خلیفۂ دوم ایسی ہر کامرانی کو من جانب اللہ یا مشیتِ الٰہی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر افتخار کا یہ سلسلہ جاری رہا تو بہت سے فتنے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ان کا سدِ باب کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا تھا۔ چناں چہ حکم نامے

میں حضرت عمرؓ نے واضح الفاظ میں اس حقیقت کی نشان دہی کر دی تھی کہ ان پر کوئی عتاب نہیں ہو رہا بلکہ محض تقاضائے مصلحت کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے۔

چناں چہ اس برطرفی کے بعد ایک موقع پر انھوں نے حضرت خالدؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے خالد، تم میرے نزدیک بزرگ و محترم ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے بہت ہی عزیز اور پیارے بھی ہو۔"

اور جب حضرت خالدؓ کی وفات ہوئی اور بنو المغیرہ کی عورتیں رنج و غم سے بے تاب ہو کر آہ و زاری کرنے لگیں تو خلیفہ نے خود بھی اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا:

"یہ عورتیں بے شک رونے اور آنسو بہانے کے لیے مجبور رہیں لیکن انھیں چاہیے کہ اظہارِ غم کے طور پر واویلا اور سینہ کوبی نہ کریں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔"

بس چلی اور پانچ منٹ کے بعد رُکی۔ رہنما نے انگلی کا اشارہ کیا کہ یہ مسجد خالد بن ولیدؓ ہے اور یہاں ہی اسلام کے عظیم سپہ سالار کا مزار ہے۔ میں نے دُور سے فاتحہ خوانی کی کیوں کہ بس میں سے کوئی یہاں جانے کو تیار نہ تھا۔ میں دل مسوس کر رہ گیا!

خالد بن ولیدؓ پر شام ہمدرد میں تین بڑے اہم لیکچر ہوئے۔ یہ میجر جنرل اے۔ آئی اکرم صاحب نے دیے تھے اور پھر سیف اللہ (سورڈ اوف اسلام) کے نام سے یہ کتاب چھپی۔ یہ کتاب اتفاق سے میں نے نیویارک میں کولمبیا یونی ورسٹی کی لائبریری میں دیکھی اور پھر میں نے اسے اپنی لائبریری کے لیے حاصل کیا۔

میجر جنرل اے۔ آئی اکرم نے خالد بن ولیدؓ کی فوجی اسٹریٹجی کا بڑا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اسلامی دفاع پر اُن کی یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ ایک فوجی کی حیثیت سے ان کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس قسم کا کام جاری رہے تو اس سے ایک اہم تاریخِ دفاعِ اسلام مرتب ہو سکتی ہے۔ اس وقت کہ میرے قلم سے یہ تحریر نکل رہی ہے مجھے یہ خیال آیا ہے کہ اس موضوع پر ایک بین الاقوامی کنگرس ہونی چاہیے اور زمانۂ اسلام کی جنگوں کے نقشوں پر کام ہونا چاہیے۔ اس کنگرس میں ماہرینِ افواج کو شرکت کرنی چاہیے۔

حمص کی تاریخ

شہر حمص کی تاریخ پر چند باتیں یہاں غیر مناسب نہ ہوں گی۔

مملکتِ شام میں دُو پہاڑوں یعنی کوہِ لبنان اور جبلِ انصاریہ کے درمیان دریائے العاصی کے مشرقی کنارے پر ایک نشیبی حصّے میں ایک وسیع اور سرسبز و شاداب علاقہ جو سطحِ سمندر سے تقریباً پانچ سو میٹر بلند ہے شہر حمص کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر کی بنیاد تو یُونانیوں نے رکھی تھی، البتہ مشہور مورخ یاقوت کی تحقیقات کے مطابق اس کا نام حمص بن المہر بن صاف بن مکنف العمالقی کے نام پر پڑا تھا۔ اس کے مشرق میں چٹیل صحرا ہے اور مغرب میں اونچا آتش فشاں پہاڑ ہے جو ایک عرصے سے سرد اور خاموش ہے۔ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے یہاں کی آب و ہَوا نہایت خوش گوار اور معتدل ہے۔ درجۂ حرارت موسمِ گرما میں زیادہ سے زیادہ ۱۶ سینٹی گریڈ تک پہنچتا ہے اور چوں کہ بارش ملک بھر میں سب سے زیادہ اسی جگہ ہوتی ہے اس لیے زرخیزی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے جس کا سبب وہ مٹی بھی ہے جو موسمِ برشگال میں پہاڑوں سے بہہ کر یہاں تک آتی ہے۔ قدرت نے یہ کیفیت حال میں پیدا نہیں کی، بلکہ زمانۂ قبلِ تاریخ سے چلی آ رہی ہے۔ اسے کاشت کاروں کی جنّت بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دو ہزار سال قبلِ مسیح اہلِ مصر نے اس زمین پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے بعد دریائے عاصی پر ایک پُل باندھنے کا منصوبہ تیار کیا تھا تاکہ پانی کو روک کر آب پاشی کا نظام قائم کیا جائے۔ اسی دریا سے سلمیہ کے مقام پر عہدِ قدیم میں ایک نہر نکالی گئی تھی تاکہ بارہ مہینے اور تیسوں دن کھیتوں اور باغیچوں کو حسبِ ضرورت پانی ملتا رہے اور صرف بارش پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ یونانیوں نے سب سے پہلے یہاں زیتون کا ایک پودا لگایا تھا اور اس طرح باغات کی ابتدا ہوئی تھی۔

یہ شہر پرانے زمانے سے کئی تجارتی راستوں پر ایک اہم مرکز کا کام بھی دیتا رہا ہے۔ یہیں سے گزر کر قافلے ایک طرف فارس اور پامیر تک اور دوسری طرف بحیرۂ روم کے ساحل تک پہنچتے تھے۔ اب بھی ان راستوں پر جن کی داغ بیل سینکڑوں سال پہلے ڈالی گئی تھی، تیز رفتار گاڑیاں اور بسیں چلتی ہیں جو مسافروں اور سامان کی حمل و نقل کے کام آتی ہیں۔ عراق کی تمام تر پیداوار اور مصنوعات اب بھی اسی راستے سے ہو کر دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ پہلے یہاں سے دمشق تک کا سفر گھوڑوں کے ذریعہ سے پانچ دن میں طے ہوتا تھا۔ اب ریلوے لائن پڑ جانے سے چند گھنٹے لگتے ہیں۔ عثمانی عہدِ حکومت میں اس مقام کو فوجی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اب بھی اسے ایک فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس مقام کے پانچ ہزار سال پُرانے تاریخی حالات کا جائزہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ فرعونِ مصر رعمسیس دُوم کی فوجوں نے سب سے پہلے دُو قریبی علاقوں، کادیش اور قطنہ پر قبضہ کر لیا تھا تاکہ قحط سالی کے زمانے میں یہاں سے اناج لے جا کر اپنے ملک کے باشندوں کا پیٹ بھرا جا سکے۔ پھر یونانی آئے جنھوں نے

آس پاس کے دوسرے علاقے بھی ہتھیا لیے۔ سیلیوکس نکاتور نامی سپہ سالار نے حمص کے مقام پر باقاعدہ ایک شہر کی تشکیل کی۔ بعد کی عمارتوں پر جن کے اب کھنڈر باقی رہ گئے ہیں رُومی طرزِ تعمیر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ جنوب مغربی گوشے میں ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا، لیکن اب نئی منصوبہ بندی کے تحت اسی کے آس پاس گلیوں اور بازاروں کا ایک جال بچھا ہُوا ہے۔

ظہورِ اسلام سے بہت پہلے یعنی ۸۱ سال قبلِ مسیح سے لے کر ۶۰ سنِ عیسوی تک ایک عرب خاندان اس جگہ حکومت کرتا رہا۔ اسی کا ایک فرماں رَوا سامیسی گرامس تھا جس نے دریائے عاصی کے کنارے اپنی رہائش کے لیے ایک عظیم محل تعمیر کرایا تھا۔ اس عہد کی دوسری عمارتوں میں بھی عرب فنِ تعمیر کے آثار ملتے ہیں۔ اسی فرماں رَوا نے ۷۸ء میں ایک مخروطی طرز کا مقبرہ اپنے کسی عزیز کے لیے بنوایا تھا جو تقریباً اٹھارہ صدیاں گزرنے کے بعد آگ سے تباہ ہوگیا۔ مقبرے کے قریب ہی سورج دیوتا کی پوجا کے لیے مندر بنوایا جس کی دیواروں کے لیے سنگِ سیاہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس مندر کی وجہ سے یہ شہر بعلبک کا ہمسر ہو گیا تھا۔

بنوتنوخ نامی قبیلے کے افراد نے بھی اس مقام کو اپنی آماج گاہ بنایا اور اپنے زمانے کے کئی آثار چھوڑے ہیں۔ کچھ نیم خانہ بدوش قبائل بھی اس جگہ آکر آباد ہوئے جن کے آثار ناپید ہیں، البتہ یمنی عربوں نے اسے بنو کلب کے علاقے میں شامل کرکے اسے جو ترقی دی، اس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ لوگ گھوڑوں کی پرورش کرتے اور بڑے شہسوار سمجھے جاتے تھے۔

پھر رُومی فوجوں نے اس علاقے پر چڑھائی کی اور شہر پر قبضہ کرلیا تو اس کا نام عمیسہ رکھا جو کچھ عرصے بعد متروک ہوگیا۔ نصرانی عہد کے بعض کتبوں سے پتا چلتا ہے کہ یہاں عرصۂ دراز تک بُت پرستی ہوتی رہی۔ تاہم پانچویں صدی عیسوی تک عیسائی مذہب پوری طرح غالب آگیا تھا اور جب ۴۵۲ء میں یوحنا اصطباغی کا سر ایک عمارت سے برآمد ہوا تو اس کی مذہبی حیثیت دوچند ہوگئی۔

ظہورِ اسلام کے بعد مسلم افواج نے اِدھر کا رُخ کیا۔ وہ ۱۶ ہجری مطابق ۶۳۷ء عیسوی میں حضرت ابوعبیدہؓ کی زیر کمان اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی ہمراہی میں کسی قسم کی خوں ریزی کے بغیر اس شہر میں داخل ہوئیں۔ یہاں کے باشندوں نے جو فنِ حرب سے بالکل ناآشنا اور ایک حد تک بزدل بھی تھے فوراً اطاعت و فرماں برداری کی پیش کش کی اور کئی ہزار دینار بطور زرِ تاوان دینے کا اقرار کرلیا۔ فوج کے ساتھ تقریباً پانچ سو اصحابِ رسولؐ بھی آئے تھے جنھوں نے مفتوحہ شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت سعید بن عامر حمص کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور فقر پسند انسان تھے۔ اپنے اہلِ خانہ کو بھی ہدایت کرتے کہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرو۔ جو

تزکیۂ اخلاق کا ذریعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار خود خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ نے اس علاقے کا دورہ کیا اور اربابِ خلافت سے درخواست کی ایک فہرست ایسے نادار لوگوں کی فوراً تیار کی جائے جن کو بیت المال سے امداد دی جاسکے۔ یہ فہرست تیار ہوئی تو علاقے کے گورنر حضرت سعید بن عامر کا نام سب سے اوپر تھا۔ امیر المومنین کو سخت تعجب ہوا۔ پتا چلا کہ وہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصّہ راہِ خدا میں دے دیتے اور خود فاقے کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے اور کئی اعتبار سے بھی ان کو آزمایا اور ان کی ضرورت سے زیادہ قناعت پسندی کی تصدیق ہوگئی۔

پھر ۲۶ ہجری مطابق ۶۴۷ عیسوی میں حضرت امیر معاویہ رضؓ نے حمص اور اس کے ساتھ ساتھ قنسرین پر قبضہ کرکے دونوں علاقوں کو اسلامی مملکت کے صوبۂ شام میں شامل کرلیا۔ یہ الحاق اس وقت تک ممکن نہیں ہوا تھا۔ ان کی حیثیت باج گزار علاقوں سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ہر سال آٹھ لاکھ درہم خراج کے طور پر سرکاری خزانے میں جمع کراتے تھے۔ مکمل الحاق کے بعد حضرت شرجیل وہاں کے والی مقرر کردیے گئے۔

اسلامی تاریخ کے عباسی عہدِ خلافت میں حمص کو نمایاں حیثیت نہ مل سکی۔ سو سال کی مدّت میں یہاں کے باشندوں میں یمنی عنصر زیادہ ہوگیا تھا جو ہر وقت آمادۂ پیکار رہتا تھا۔ اسی لیے خلیفہ ہارون الرشید نے ناراض ہوکر اس کے خلاف تادیبی اور بعض صورتوں میں تعزیری کارروائی کا حکم نافذ کیا جس کے بعد وہ لوگ مالیانے کے طور پر سوا تین لاکھ دینار اور انگوروں سے لدے ہوئے سَو اُونٹ دینے کے لیے تیار ہوگئے۔

مزید ایک سو سال گزرنے کے بعد خلافتِ عباسیہ میں زوال کے آثار نمودار ہوئے تو شام میں ایک لحاظ سے طوائف الملوکی شروع ہوگئی۔ احمد ابن طولون نے حمص اور آس پاس کے علاقوں کو اپنے دائرۂ اقتدار میں شامل کرلیا۔ پھر فاطمیوں کے دَور میں بھی صورتِ حالات پنپ نہ سکی اور جب صلیبی جنگیں شروع ہوئیں تو رہی سہی شان بھی غارت گری کی نذر ہوگئی۔ ہر چند کہ بہت جلد حضرت صلاح الدین ایوبی نے اس پر قبضہ کرکے اسے اپنا مرکزِ دفاع بنالیا، لیکن پہلی سی بات دوبارہ اپنا رنگ نہ جماسکی۔ شہر کی دیواریں جو مضبوط تراشیدہ پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں برقرار رہیں لیکن شہر پناہ کے اندر کی عمارتیں مسمار ہوگئی تھیں۔ محض چند مسقف بازار شکست و ریخت سے بچے رہ گئے تھے۔

عثمانی دَورِ حکومت میں شہر نے سنبھالا لیا۔ یہاں کی بہت سی پیداوار، جس میں اناج کے علاوہ پنیر، تیل اور انگور شامل کیے جاسکتے ہیں، قریبی علاقوں کے لیے برآمد ہونے لگی جس سے ذرائع آمدنی میں

زبردست اضافہ ہوا۔ اس شہر کی صنعت پارچہ بافی نے بھی ترقی کی۔ وہ ریشم کے اہم مرکزوں میں شمار ہونے لگا، کیوں کہ یہاں کے باشندوں نے باقاعدہ ریشم کے کیڑے بڑے پیمانے پر پالنے شروع کر دیے تھے۔ ریشم کے کیڑے شہتوت کے پتوں پر پرورش پاتے ہیں، چناں چہ ان کے پودے بڑی مقدار میں لگائے گئے۔ شہتوت کا پھل بھی سامانِ تجارت میں شامل ہوگیا۔ ریشم کے ساتھ بادلے کے تار ملاکر منقش اور زرکار کپڑے بھی تیار ہونے لگے جن کی مانگ دوسرے ملکوں میں بڑھ گئی۔

لیکن شان و شوکت زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ لوگ عیش و عشرت میں پڑکر اپنی ترقی کی راہوں کو گم کر بیٹھے۔ بیرونی حملوں کے علاوہ خانہ جنگی نے بھی بیڑا غرق کیا۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں شہر پناہ کے دروازے مسمار ہو گئے تھے جو دوبارہ نہ بن سکے اور اس طرح حملہ آوروں کے لیے آسانی سے داخل ہونے کے راستے کھُل گئے۔

چناں چہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اس شان دار شہر کی حیثیت ایک بار پھر معمولی قصبے کے برابر ہوگئی۔ آبادی گھٹ کر دو ہزار رہ گئی جس میں عرب مسلمانوں کے علاوہ یونانی عیسائی بھی شامل تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں مصر کے جاں بازوں نے اس مقام پر قبضہ کرلیا لیکن شہر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جس سے سخت نقصان پہنچا۔ ۱۸۴۰ء میں ترکی نے مصالحت کے لیے قدم بڑھائے اور ایک بار پھر علاقے پر قبضہ کرلیا، لیکن مقصد اس کا استحصال نہیں تھا۔ قابضین نے انتہائی کوشش کی کہ صنعت و حرفت اور زرعی پیداوار کو دوبارہ فروغ نصیب ہو۔ آبادی بڑھنے لگی۔ شہر کے کھنڈرات نئی منصوبہ بندی کے تحت دوبارہ تعمیر ہونے لگے۔ پُرانی رونق لوٹ آئی۔

۱۹۲۰ء تک آبادی پچاس ہزار اور ۱۹۶۰ء میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ اب دُو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس میں بیس فی صد عیسائی شامل ہیں۔ یہودی برائے نام رہ گئے ہیں۔ اگرچہ یہاں کی بہت سی پُرانی عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں تاہم بے شمار مسجدیں، حمام، مزار اور خانقاہیں اب بھی محفوظ ہیں اور ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش برابر کی جارہی ہے۔

مجھے جاگتے ہوئے اب ۴۸ گھنٹے گزر چکے ہیں اس سفر نے تھکا بھی دیا ہے اور پھر صبح سے جن حالات سے گزر رہا ہوں ان کا اور آخری طور پر خالد بن ولیدؓ کے مزارِ اقدس پر حاضری نہ دینے کا دل و دماغ پر بڑا ہی اثر ہے اور بار ہے۔ میں نے بس کی غیر آرام دہ کرسی پر آنکھیں بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈاکٹر سہیلہ الجبوری نے گرم چادر جو انھوں نے پاکستان میں خریدی تھی، اتار کر تہہ کر کے میرے سر کے پیچھے رکھ دی اور

میں واقعی کوئی ایک گھنٹے سویا۔ حمص دمشق کے مقابلے میں سرد تھا۔

نو بجے کے قریب جامعہ حلب کے کلیۃ الطب پہنچے۔ یہاں رجسٹریشن کے لیے کارکن موجود تھے۔ ہم سب نے رجسٹریشن کرایا۔ ہوٹلوں کے کمرے الاٹ ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایرانیوں کو الگ الگ ہوٹل دیے گئے ہیں مگر انھوں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ڈاکٹر سہیلہ اور مجھے کمرے ایک ہی ہوٹل میں ملے۔ ڈاکٹر مہدی محقق اور ان کی اہلیہ بھی ہمارے ہوٹل میں ہوں گے۔ اب یہ چار کا گروپ بن گیا ہے۔ جگہ جگہ مندوبین کو اُتارتی ہوئی بس ہوٹل (فندق السیاحی) آئی۔ یہ مرکزی جگہ ہے۔ مجھے کمرہ ۲۱۶ ملا ہے۔ رات کے دس بج گئے ہیں۔ سب کا حال خراب ہے۔ طے یہ پایا کہ بس اب اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کیا جائے۔ میں تو دوپہر کو کھانا کھا ہی چکا تھا۔ اب کھانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ میں نے اطمینان کے ساتھ غسل کیا۔ اپنے بیگ میں سے قبلہ نما نکال کر سمتِ قبلہ متعیّن کی اور نمازِ عشا قصر ادا کر کے ۱۱½ بجے شب بستر پر لیٹ گیا۔

۵-اپریل ۱۹۷۹، بُدھ، حلب

صبح چار بجے آنکھ کھل گئی۔ بڑا غصہ آیا کہ میرے دماغ میں جو گھڑی لگی ہوئی ہے اس کے الارم کی باقاعدگی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے! آخر کبھی تو نیند کا عرصہ طویل ہونے دینا چاہیے۔ میں دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کوئی ساڑھے چار بجے کا عمل تھا کہ برابر میں کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ یہ آواز سننے کے بعد کوئی کافر ہی سو سکتا ہے۔ میں بستر سے اُٹھ گیا۔ بڑا نرم گرم بستر ہے! میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ شیطان کی شکستِ فاش پر تھا۔ میں اللہ کے حکم کی تعمیل میں وضو کر کے اس کے حضور حاضر ہو گیا اور شیطان شرمندہ ہو کر رُوپوش ہو گیا!

نمازِ فجر کے بعد میں دوبارہ لیٹ گیا اور دو گھنٹے شکر خوابی میں گزارے۔ اُستاذی محترم مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے شکر خوابی کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ انسان لیٹ تو جائے مگر نہ سو سکے اور نہ جاگ سکے۔

پُرانے دوست!

نو بجے تیار ہو کر نیچے ہوٹل کے لاؤنج میں آیا۔ ڈاکٹر سہیلہ بھی تشریف لے آئیں۔ اب جو میں نے اپنے ماحول کو دیکھا تو یہاں تو گویا سارے ہی پُرانے دوست تھے! بڑی حیرت ہوئی۔ دل باغ باغ ہوا۔ کس کس کا نام گِناؤں!

انٹرنیشنل یونین اوف دی ہسٹری اینڈ فلاسفی اوف سائنس کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر ایرک فوربس اور ان کی اہلیہ، ان سے قدیم دوستی ہے۔ ایڈنبرا میں رہتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی بڑے دل چسپ انسان ہیں۔ ان سے مل کر دل خوش ہوا کرتا ہے۔ پروفیسر احمد سلیم سعیدان (جامعۂ اردن (عمان) میں استادِ ریاضی ہیں۔ اپنے میدان میں استاد الاساتذہ، بڑے نفیس انسان۔ پاکستان میں دو بار ان کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ میں خود بھی عمان ان کے ہاں گیا ہوں۔ انتہائی شریف النفس انسان، کیا کیا ان کی صفات گناؤں۔ ان کو دیکھ کر یاد آیا کہ قاہرہ میں (۱۹۷۵) ایک تقریب میں رقصِ عریاں شروع ہو گیا۔ نہ مجھ سے برداشت ہوا اور نہ پروفیسر سعیدان سے۔ مَیں اور وہ نیز ان کی اہلیہ وہاں سے اُٹھ گئے اور ہوٹل واپس آ گئے۔ اس بار اُن کی اہلیہ ساتھ نہیں ہیں۔ پروفیسر محمد سُوسی (تُونس) وہ اور اُن کی اہلیہ اور نواسی آئینوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ محمد سُوسی بھی دو بار پاکستان آ چکے ہیں اور ہمدرد کے مہمان رہے ہیں۔ جامعہ تُونس میں اُستاد ہیں۔ ان سے عالمی کنگرسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور پروفیسر خولودولین دونوں ہاتھ باندھے "نمستے" کہہ رہے ہیں۔ ان سے بھی بغل گیر ہو گیا۔ بڑے اچھے دوست ہیں۔ رُوسی ہیں۔ ان دِنوں یونیسکو میں شعبۂ سائنس اور اعلا تعلیم کے نگراں ہیں۔ خود ماہرِ ریاضیات ہیں۔ ان کے ساتھ روسی گروپ تھا۔ ان میں سے دو میرے دوست ہیں۔ ڈاکٹر کنگ اسلامی ایسٹرونومی میں ماہر۔ ان سے پہلی بار ملاقات استنبول میں ہوئی۔ پھر میں قاہرہ (مصر) میں ان کے انسٹی ٹیوٹ ملنے گیا۔ جوان ہیں مگر تبحّرِ علمی قابلِ قدر۔ پروفیسر ایڈورڈ کنیڈی! ان کو میں نے چوم لیا۔ ریاضی کے عالمی ماہرین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بیروت سے ان سے یاد اللہ ہے۔ اس کے بعد ان سے جاپان (ٹوکیو) میں ملاقات ہوئی۔ وہاں تاریخ سائنس کی عالمی کنگرس تھی۔ کنگرس ختم ہوئی تو ایک صبح میں نے دیکھا کہ ایڈورڈ کنیڈی نے اپنا سامان کمر پر لادا ہے اور پیدل چلے جا رہے ہیں۔ میں نے ان کو موٹر میں بٹھا کر منزلِ مقصود پر پہنچانا چاہا مگر وہ اپنی راہ پر چلنے پر مُصر تھے۔ میں یہ نقشہ اپنے ذہن سے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کس قدر عظیم انسان ہیں! سالِ گزشتہ میں قاہرہ گیا تھا۔ وہاں اُن کے انسٹی ٹیوٹ میں گیا تھا۔ آج پھر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔

احباب سے ملاقاتوں میں ایک گھنٹہ ایسا گزر گیا کہ جیسے پلک جھپکائی ہو! بھوکا تھا، مَیں اور ڈاکٹر سہیلہ ناشتے کے لیے گئے۔ خاصا ناشتا تھا۔ اتنے میں بسیں آ گئیں اور ہم سب سوار ہو کر جامعہ حلب آ گئے اور کلیۃ الطب کے وسیع ہال میں پہنچا دیے گئے۔ میری مسرت اور حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہاں درجنوں دوست جو پہلے ہی موجود تھے ایک ایک کر کے مجھ سے

لپٹ گئے اور ذرا دیر کے لیے میں ہی یہاں سب کی توجہ کا مرکز بن گیا! ویسے بھی سفید بُراق کپڑے کب توجہ جذب نہیں کرتے ہیں! ہندوستان کے پروفیسر سوبرایا پا، علی گڑھ یُونی ورسٹی کے ڈاکٹر رضی اللہ انصاری، حلب یُونی ورسٹی کے پروفیسر سلمان قطایہ، جامعہ قاہرہ (مصر) کے پروفیسر شرکی، جلال، پنجاب یُونی ورسٹی پٹیالہ کے پروفیسر ڈاکٹر شرما، ہارورڈ کے ڈاکٹر جارج صلیبا اور مترجم کتاب المناظر ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ، کس کس کا نام بتاؤں۔ ان سب دوستوں سے گلے مِل کر کنگرس ہال میں بڑا عجیب منظر پیدا ہوگیا! آج میرا دل بڑا ہی خوش ہے کہ یہ دوست بھی مجھے اِس طرح ہی عزیز رکھتے ہیں جیسا کہ میں ان کو عزیز رکھتا ہوں۔ یہ عالمی برادری اور یہ عالمی تعارف بڑا رُوح افزا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

سمپوزیم کا افتتاح

بین الاقوامی مذاکرۂ تاریخ سائنس عربی کا افتتاح صدر جمہوریۂ شام جناب حافظ الاسد صاحب کو کرنا تھا کہ وہی اس مذاکرے کے سرپرست بھی ہیں، مگر معلوم ہوا کہ وہ تشریف نہیں لائیں گے اور افتتاحی اجلاس اُن کے بغیر ہوگا۔ میں نے اس ہال کا جائزہ لیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ یہاں مندوبین کے لیے کوئی امتیازی جگہ نہیں ہے، جہاں جس کا دل چاہے اُسے بیٹھ جانا چاہیے۔ ایران کے بعد یہاں دُوسری بار دیکھا کہ اگلی صفوں میں عہدے دارانِ حکومت کو رکھا جاتا ہے۔ میں نے اب تک جتنی کنگرسیں پاکستان میں منعقد کی ہیں اُن میں مندوبین کے لیے امتیازی جگہ رکھی ہے، کیوں کہ یہ اہلِ علم ہیں اور ان کا مقام حکّام سے بلند ہے۔ خود حاکم کو علما کا احترام کرنا چاہیے۔ میں اس امتیاز کو اہمیت دیتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ اس روایت کو قائم اور باقی رکھا جائے۔ پھر اندازِ فکر یہ بھی تو ہونا چاہیے کہ یہ مندوبین اور علما ہی تو ہیں جن سے یہ کنگرس عبارت ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو کیسی کنگرس اور کیسا سمپوزیم! اِس اعتبار سے بھی عالمی اجتماعات میں احترامِ علما کا خیال رکھنا چاہیے۔

افتتاحی تقریب تلاوتِ کلامِ پاک کے بغیر شروع ہوگئی۔ اور سات آٹھ مقررین آئے۔ ایک قصیدہ بھی تھا۔ یونیسکو کی جانب سے پروفیسر خولودولین نے ایک جامع اور مؤثر تقریر کی۔ انٹرنیشنل سوسائٹی اوف دی ہسٹری اوف مڈیسن کے سکرٹری جنرل پروفیسر لوئی دلو نے فرانسیسی میں تقریر کی۔ ان سے ایک تفصیلی ملاقات بلغاریہ میں سالِ گزشتہ ہوئی تھی۔ انٹرنیشنل سوسائٹی اوف دی ہسٹری اوف مڈیسن کی رُکنیت کے لیے میرا نام پیش کیا اور مجھے اطلاع دی کہ میرا

انتخاب ہوگیا ہے۔ میرے پیارے دوست ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صدر، جامعۂ حلب، نے بڑی مؤثر تقریر کی۔ اس مذاکرے کے وہی بانی ہیں اور منتظم۔ بڑی متحرک شخصیت ہیں۔ عربی سائنس کے میدان میں اَن تھک محنت کر کے انھوں نے ایک مقام پیدا کر لیا ہے اور اب جامعہ حلب میں ایک بڑا انسٹی ٹیوٹ زیرِ تعمیر ہے۔ ڈاکٹر حسن ہمیشہ کہتے ہیں کہ حکیم سعید! مَیں نے آپ سے اِنسپائر ہو کر یہ کام کیا ہے۔ ان کے اس جملے سے میرا دل بڑا خوش ہوتا ہے کہ کم از کم شام میں ہی یہ کام ہو گیا۔ میں پاکستان میں یہ کام کرنے کا آرزومند تھا اور میں نے بڑی محنت سے پاکستان میں تاریخِ سائنس کے لیے ماحول پیدا بھی کر دیا۔ ابن الہیثم پر قومی کانفرنس اور البیرونی پر ایک بے مثال عالمی کنگرس، ریاضیات پر ایک تاریخ ساز عالمی کنگرس نے پاکستان میں تاریخِ سائنس کے لیے راہوں کو ہموار کر دیا اور ذہنوں کو بیدار۔ مگر اس کے باوجود کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔ میں پاکستان میں بیوروکریسی کے سامنے تھک گیا۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ جامعہ کراچی میں تاریخِ سائنس کی ایک چیئر قائم ہو جائے مگر میری پیش کش کی وہاں ناقدری ہوئی۔ مَیں نے وزارتِ تعلیم اور پاکستان سائنس فاؤنڈیشن سے درخواستیں کیں اور ایک اچھی رقم کی بھی پیش کش کہ سرکاری سطح پر ایک انجمن تاریخِ سائنس قائم کر دی جائے مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔ میرے لیے ممکن تھا کہ میں ایسی ایک انجمن قائم کر دیتا، مگر میں چاہتا تھا کہ یہ کام سرکاری سطح پر ہو کہ یہی مناسب و مؤثر ہوتا۔ میری رائے میں اب پھر یہ بات قابلِ لحاظ ہے، پاکستان کو ایک نیشنل ایسوسی ایشن فار دی ہسٹری اوف سائنس قائم کرنی چاہیے۔

عالی مرتبت صدر جمہوریہ شام کا پیغام جناب محترم وزیرِ تعلیم شام پروفیسر فحام نے پڑھ کر سُنایا اور ان کے پیغام کے ساتھ اس عالمی سمپوزیم کا افتتاح ہو گیا۔ فروگزاشتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے اور یہ اطمینان کرنا چاہیے کہ عالمِ اسلام میں اب یہ حِس بیدار ہو گئی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر ترقی و تعمیر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ تاریخِ سائنس کے تمام ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا چاہیے تاکہ عالمِ اسلام کے سامنے اس کی ایک مربوط تاریخِ سائنس آ سکے۔ اس میدان میں جامعۂ حلب میں پروفیسر احمد یُوسف الحَسن نے جو کام کر دیا ہے اس کی داد دینی چاہیے اور اس انسان کو اعلا مقام دینا چاہیے۔ اس میدان میں پاکستان کے پیچھے رہ جانے کا مجھے جس قدر صدمہ ہے اسی قدر مجھے مسرّت ہے کہ عالمِ اسلام کے اس فرزندِ جری نے مردانہ وار اِس میدان میں قدم رکھ دیا ہے! اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرمائے!

آج کے پروگرام میں شام کے وزیرِ دفاع جناب محترم السید العماد مصطفیٰ طلاس کا خطاب

شریک تھا۔ ان کا موضوعِ تقریر تھا "تہذیبِ اسلام میں سائنس کا مقام"۔

جلسۂ افتتاحی کے بعد چائے پانی ہوا۔ اس وقفے میں مَیں نے ڈاکٹر عبد الحمید صبرہ صاحب سے تبادلِ خیال کر لیا۔ اس کے بعد اِسی ہال میں ایک بجے سب پھر جمع ہو گئے اور جب خطاب کے لیے وزیرِ دفاع آئے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور مسلسل گونجتا رہا۔ ان کا یہ دوبارہ استقبال ہُوا ہے۔ ایسا استقبال وزیرِ التعلیم العالی الاستاذ (پروفیسر) الدکتور شاکر الفحام کا نہیں ہوا۔ مَیں نے اس فرق کو محسوس کیا۔ میری رائے میں یہ فالِ نیک نہیں ہے۔ وزیرِ دفاع کی تقریر بہت صاف رہی۔ ان کی عربی بڑی حد تک سمجھ رہا تھا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ان کی تقریر پروگرام میں دیے ہوئے موضوع سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ میں اس کو بڑی آسانی سے ایک سیاسی تقریر کہہ سکتا ہوں۔ اس میں زوالِ شاہِ ایران تک کا تو ذکر تھا۔ میں خائف تھا کہ پاکستان کا ذکر حالیہ واقعات کے حوالے سے نہ آجائے، مگر ایسا نہیں ہوا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ظاہر ہے کہ اگر ذکر آجاتا تو وہ پاکستان کی موجودہ قیادت کے خلاف ہوتا۔

سہ پہر کا اجلاس ساڑھے چار بجے کے لیے تھا۔ ہم سب مندوبین جامعۂ حلب کی آرام دہ بسوں میں سوار ہو کر جامعۂ حلب وقت پر پہنچ گئے مگر اجلاس کا آغاز پانچ بجے ہو سکا۔ عالمی اجتماعات میں پابندیٔ وقت جس قدر ضروری ہوتی ہے اسی قدر اس میں رخنے پڑتے ہیں۔ اور یہ ایک بڑا آرٹ ہے کہ ہر جلسہ وقت پر شروع کرا کے اسے وقت پر ختم کرا دیا جائے۔ اس کے لیے منتظمین کو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور صدرِ جلسہ کو بڑی احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر اس نظم پر عبور حاصل نہ ہو تو پھر کنگرس کا علمی مرتبہ مجروح ہو جاتا ہے اور اس جراحت کا اندمال اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کنگرس کی رُوداد چھپ کر تیار نہ ہو جائے۔

آج کے جلسے کی صدارت ڈاکٹر عبد الحمید صبرہ کر رہے تھے۔ میرے بڑے عزیز دوست ہیں۔ ان سے آج تبادلِ خیال ہوا ہے اسے میں آخر میں لکھوں گا۔ مقررین حسبِ ذیل تھے:

ڈاکٹر جارج صلیبا۔ ان سے میری بڑی پرانی دوستی ہے۔ سنہ ۱۹۷۲ میں جب میں سان فرانسسکو (امریکا) گیا تھا تو اُن دنوں برکلے یونی ورسٹی میں یہ ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ اس سے قبل بھی ان سے بارہا ملاقات ہوئی تھی، مگر دوستی میں پختگی سان فرانسسکو میں آئی کہ جب میں کئی دن برکلے یونی ورسٹی میں اُن کے ساتھ رہا تھا۔ ان کا موضوع اسلامی آسٹرونومی ہے۔

دوسرے مقرر ڈاکٹر زکی اسکندر تھے۔ ان سے بے تکلفی نہیں ہے مگر یاد اللہ خوب ہے۔ ذرا لیے دیے رہتے ہیں۔ کنگرس عالمی ابوریحان البیرونی میں ان کو میں نے پاکستان آنے کی دعوت دی

تھی، مگر وہ مصروف انسان ہیں۔

تیسرے مقرر ڈاکٹر ڈیوڈ کنگ تھے۔ ان سے بڑی اچھی دوستی استنبول میں ہوئی کہ جب سنہ ۷۷ ۱۹ میں مَیں قندیلی آبزرویٹری (رصدگاہِ قندیلی) کے جشن چار سو سالہ میں شرکت کے لیے گیا تھا اور میں اس عالمی کنگرس کی مجلسِ منتظمہ میں تھا۔ ڈیوڈ کنگ اسلامک آسٹرونومی پر بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔ خود انگریز ہیں۔ امریکی سرمائے سے قاہرہ میں ایک انجمن تحقیقِ مصریات میں کام کرتے ہیں۔ عربی پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ میں گزشتہ دنوں جب قاہرہ گیا تھا تو ڈیوڈ کنگ سے ملنے گیا تھا۔ میں نے اُن کو دعوت دی تھی کہ وہ "اسلامی آسٹرونومی کے چودہ سو سال" پر ایک کتاب تیار کر دیں، اس کا پورا خرچ ہم دیں گے۔ مگر پتھر بھاری تھا کنگ نے چوم کر چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی اس گفت گو میں عالمِ بے بدل ڈاکٹر ایڈورڈ کنیڈی کو بھی شریک کیا تھا۔ وہ اُن دنوں قاہرہ ہی میں مقیم تھے اور انجمن تحقیقِ مصریات میں کام کر رہے تھے۔ مگر بات بنی نہیں۔

درحقیقت وقت اس قدر کم ہے کہ کوئی عالم ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ میں نے چودہ سو سالہ جشنِ اسلام اور استقبال ۱۵ ویں صدی ہجری کی تحریک فروری سنہ ۷۴ ۱۹ میں کی تھی کہ جب لاہور (پاکستان) میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تھی۔ اگر اُس وقت سے اس کام کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لیا جاتا جیسا کہ میں نے ساری دُنیا کی حکومتوں کو مشورہ دیا تھا تو اُس وقت سے پورے سات سال تیاری کے لیے ہمارے پاس تھے اور یہ اچھی خاصی مدت تھی، مگر میرے اس تصور کو اہمیت سنہ ۷۷ ۱۹ میں حاصل ہوئی اور اسلامی وزرائے خارجہ نے بالآخر استنبول میں آکر فیصلہ کیا۔

آج کے جلسے کی یہ چاروں عالمی شخصیتیں میری اچھی دوست ہیں۔ بڑا عالمانہ جلسہ رہا۔ ڈیوڈ کنگ کو میں نے مبارک باد دی۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ اور مَیں آپس میں بیٹھ کر تبادلِ خیال کریں۔ شاید اس کے لیے وقت مل جائے گا۔ اندازہ یہ ہوا ہے کہ پروفیسر ایڈورڈ کنیڈی قاہرہ سے مستقلاً حلب آ رہے ہیں اور انسٹی ٹیوٹ تاریخِ سائنس عربی میں کام کریں گے کہ جو پوری توجہ سے یہاں قائم ہو رہا ہے اور ڈیوڈ کنگ اب قاہرہ چھوڑ کر شاید امریکا جانا چاہتے ہیں۔

کتاب المناظر

ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ مصری ہیں، مگر علمی میدانوں میں کام کرنے کے لیے وہ اپنے وطن سے باہر ہیں۔ سنہ ۱۹۶۹ میں جب میں نے بابائے بصریات ابن الہیثم پر پاکستان میں ایک نیشنل

کانفرنس کا انتظام و انعقاد کیا تو اب اندازہ ہوا ہے کہ یہ ایک تاریخ ساز اقدام تھا۔ پروفیسر حمید عسکری مرحوم (لاہور) کو اس شعبۂ علم سے بڑی دل چسپی تھی۔ اُن سے تبادلِ خیال کے بعد میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ پاکستان میں بڑی محنت سے میں نے یہ کام کر لیا اور اس کی رُوداد چھپوا کر ساری دُنیا میں تقسیم کرا دی۔ اس کے بعد سے ابن الہیثم پر از سرِ نو شاید ساری ہی دُنیا میں تحقیقی کام کا آغاز ہو گیا۔ ان دنوں مَیں نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ ابن الہیثم کی "کتاب المناظر" کا انگریزی ترجمہ کروں گا۔ اس اعلان کے جواب میں ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ صاحب کا خط مجھے ملا کہ وہ یہ کام کر رہے ہیں، اس لیے مناسب ہو گا کہ ڈُپلی کیشن نہ ہو۔ میں نے اُن کی بات مان لی اور یہ کام اُس وقت سے ڈاکٹر صبرہ کے سپرد رہا۔ اُن دنوں وہ لندن میں وارز برگ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھے۔ میں خود لندن اُن سے ملنے گیا اور اُن کے کام میں تعاون کا بھی یقین دلایا۔ اس کے بعد صبرہ ہارورڈ یونی ورسٹی امریکا کے شعبۂ تاریخِ سائنس سے وابستہ ہو گئے۔ میں وہاں اُن سے دو بار ملنے گیا اور اُن کے کام کی پروگریس دیکھتا رہا۔ ان کو زبانی اور پھر تحریری طور پر یقین دلایا کہ ترجمہ کتاب المناظر کی اشاعت میں مالی مشکلات ہوں تو ہمدرد اس میں ان کی مدد کرے گا۔ اس کے بعد میں نے سنہ ۱۹۷۷ کے ہمدرد کے بجٹ میں ۲۵ ہزار رُپے بھی رکھوا دیے۔ ابن الہیثم پر ابتدائی کام مَیں نے کیا تھا، اس لیے میری یہ خواہش رہی ہے کہ کتاب المناظر کی اشاعت ہمدرد کی جانب سے ہو۔ یہ ایک نہایت اہم اور تاریخ ساز کام ہے۔ اس ترجمۂ انگریزی کی اشاعت کے بعد ساری دُنیا پر یہ آشکار ہو گا کہ مغرب کے ماہرین کی بصریات پر کئی کتابیں کتاب المناظر کی خوشہ چیں ہیں اور بعض نے تو لفظ بہ لفظ خوشہ چینی کی ہے اور ابن الہیثم کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ میں نے آج ڈاکٹر صبرہ سے بات کی۔ انھوں نے بتایا کہ مسودہ انگلستان کے ایک مطبع کے پاس ایک سال سے پڑا ہے اور اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ مجھے ذرا سا دکھ ہوا کہ صبرہ صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے لندن کے اشاعت گھر کو چُنا ہے۔ شاید اس سے کتاب کا حلقۂ فروخت زیادہ ہو جائے۔ میں نے ان سے آج پھر کہہ دیا ہے کہ ہمدرد کو اس کام سے دل چسپی ہے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا ہے۔ ان کے پاس ہمدرد کی جانب سے تحریری وعدہ ہے کہ ۲۵ ہزار ان کو امداد کے طور پر دیے جا سکیں گے۔

کم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ مصر کے عالمی شہرت والے آسوان ڈیم کے بارے میں سوچنے والی سب سے پہلی شخصیت ابن الہیثم کی ہے۔ مگر ایک ہزار سال قبل یہ ممکن نہ ہو سکا کہ یہ ڈیم تیار کر لیا جائے۔ ابن الہیثم کی ناکامی پر خلیفہ الحاکم اُن سے ناراض ہوا اور اس حد تک کہ ابن الہیثم

کو پاگل اور مجنوں ہو جانے کا سوانگ بھرنا پڑا تھا حتیٰ کہ وہ جیل میں اس وقت تک رہے کہ جب تک خلیفہ الحاکم بقیدِ حیات رہے۔ میں نے اصرار کیا کہ جدید تعمیر کردہ آسوان ڈیم پر ابن الہیثم کی تختی لگانی چاہیے۔ سنہ ۱۹۷۵ء میں جب میں آسوان گیا تو ڈیم پر اس وقت یہ تاریخ ساز کام ہو چکا تھا، ابن الہیثم کی تختی لگ گئی تھی!

آج سہ پہر کے اجلاس کے آغاز میں خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ صاحب نے بڑی جرأت کے ساتھ کہہ دیا کہ آپ نے اگر میری تقریر سے وہ توقعات وابستہ کی ہیں کہ جو آج دن والے لیکچر سے متعلق ہیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ وہ وزیرِ دفاع صاحب کی تقریر پر کلماتِ طنز کہہ رہے تھے۔ رات کا کھانا آج عالی مرتبت صدر جمہوریہ شام جناب محترم حافظ الاسد صاحب کے ساتھ تھا۔ انھوں نے مندوبین کے اعزاز میں عشائیہ دیا تھا، مگر وہ خود تشریف نہ لا سکے۔ وزیرِ تعلیم العالی جناب پروفیسر ڈاکٹر شاکر الفحام نے نیابت کی۔ صدر جامعۂ حلب ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب نے وزیرِ تعلیم صاحب سے میری خصوصی ملاقات آج کرا دی ہے۔

محترمہ نوشیں خانم مہدی محقق پوچھتی تھیں: حکیم صاحب! کھانا یہاں کا کیسا ہوگا؟ میں نے کہا کہ دُنبہ مُسلّم اور مٹھاس میں بکلاوہ۔ آج کا کھانا خصوصی شامی تھا اور یہ دونوں چیزیں بہرحال موجود تھیں۔ ہمارے گروپ میں آج روس کے پروفیسر خولودولین

اور پروفیسر جمشید آذر بائی جانی تھے۔ باقی ہم چار، یعنی پروفیسر مہدی محقق، اُن کی اہلیہ، ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری اور راقم الحروف۔ خوب باتیں ہوئیں۔ پاکستان، ایران، عراق اور روس! یہ اجتماع کم معنی خیز نہیں ہے!

رات ساڑھے بارہ بجے "فندق السیاحی" واپس آگیا۔ نمازِ عشا ادا کر کے میں نے تمام دن کا بھرپور جائزہ لیا اور اس سمپوزیم پر ایک اجتماعی نظر ڈالی۔ اب تک صورتِ حال یہ ہے کہ اس سمپوزیم میں حسبِ ذیل ممالک حصّہ لے رہے ہیں:

الدول العربیہ: جمہوریۂ عربیہ شام، اردن، الجزائر، لیبیا، کویت، لبنان، عراق، سعودی عرب، تونس، مصر، یمن۔

الدول الاجنبیہ: روس، انگلستان، فرانس، بلجیم، پاکستان، اسپین، یونان، امریکا، دونوں جرمنی، ترکی، ہالینڈ، انڈیا، کناڈا، ایران، بولونیا، فن لینڈ اور اٹلی۔

حسبِ ذیل عالمی اداروں کا اس سمپوزیم کو تعاون حاصل ہے: المنظمۃ العربیہ

للتربیۃ والثقافۃ، یونیسکو، انٹرنیشنل یونین تاریخ فلسفہ سائنس، انٹرنیشنل یونین تاریخِ طب،
آخرالذکر دو سے میرا تعلق ہے۔ آخرالذکر کا رُکن مجھے سالِ گزشتہ ہی بنایا گیا ہے۔

میں نے ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسلامک سائنس کا لفظ استعمال کریں، محض عربک سائنس جامع نہیں ہے۔ اس ملاقات میں پروفیسر منٹگمری واٹ بھی تھے کہ جو اسلامیات پر معروف مستشرق ہیں اور میرے بڑے پیارے دوست ہیں۔ میں ان کا حد درجہ احترام کرتا ہوں۔ ایڈنبرا میں واٹ صاحب نے لنچ پر مدعو کیا تھا، میں اور ڈاکٹر یوسف الحسن۔ بس ہم دو اُن کے ساتھ تھے۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا تھا۔ اس ذیل میں ذہن نے اس وقت زیادہ کام کیا تھا کہ جب بیروت (لبنان) میں سنہ ۱۹۷۵ میں ایک کانفرنس جامعۃ بیروت کی جانب سے ہوئی تھی پاکستان سے میں نے اس میں شرکت کی تھی اور ایران سے پروفیسر مہدی محقق اور پروفیسر شہیدی آئے تھے۔
اِس کانفرنس میں جب تجاویز مرتب اور منظور ہو رہی تھیں تو میں نے محقق صاحب سے مشورہ کیا اور پھر ڈاکٹر شہیدی صاحب کہ جو عربی خوب جانتے تھے، سے کہا کہ وہ عربی کی جگہ اسلامی کے استعمال کی تجویز پیش کریں۔ چناں چہ ایران اور پاکستان کی طرف سے مسئلہ پیش ہوا اور بالآخر طے یہ پایا کہ عربی/ اسلامی اب استعمال ہوگا۔ میں نے ایڈنبرا میں ڈاکٹر احمد صاحب کو اس تجویز کے حوالے سے بھی باخبر کر دیا تھا۔ مگر انھوں نے عربی ہی استعمال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عرب کے علاوہ باقی ہر ملک اجنبی قرار پایا اور عالمِ اسلام کا ہر ملک دُنیائے عرب کے لیے اجنبی ہے۔ اس سمپوزیم میں ایران اور پاکستان اور ترکی کے علاوہ کسی اور اسلامی ملک کی نمائندگی نہیں ہے۔ آخر انڈونیشیا ہے، ملیشیا ہے، افغانستان ہے، بنگلہ دیش وغیرہ، مگر دنیائے عرب کے نزدیک ان کا شمار آج بھی اجنبی میں ہو رہا ہے!

مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔ مجھے آج پھر یہ خیال آیا ہے کہ پاکستان میں ایک انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک سائنس وجود میں آنا چاہیے اور اس کام کو پوری سنجیدگی کے ساتھ کر ڈالنا چاہیے۔

۶ اپریل سنہ ۱۹۷۹، جمعۃ المبارک

آج سے سمپوزیم کے علمی اجلاس شروع ہو گئے ہیں۔ تاریخِ طب کے شعبے کا پہلا اجلاس میری صدارت میں ہوا۔ میرے ساتھ المقرر (رپورتیر) میرے دوست ڈاکٹر سلمان قطایہ صاحب ہیں کہ جو جامعۃ حلب سے وابستہ ہیں۔ ان کے ساتھ بلغاریہ میں رہنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔ ان

کے بیوی بچے بھی وہاں تھے۔ میری اور ان کی گہری دوستی پلاف ڈف (بلغاریہ) میں ہوئی جہاں ہم عالمی کنگرس تاریخِ طب میں شریک تھے (۱۹۷۸)۔ اس کنگرس میں ہم واقعی اجنبی تھے، زبان وہاں رُوسی تھی۔ بلغاریہ کی زبان کہ جو رُوس کے قریب تر ہے۔ ایسے ماحول میں انگریزی دانوں کا گروپ الگ ہوگیا۔ اس میں امریکا، اوسٹریلیا وغیرہ کے مندوبین بھی شریک ہوگئے، اور پھر ایک بس پر انگلش اسپیکنگ گرُوپ کا بورڈ بھی لگ گیا۔ ظاہر ہے کہ میں سب سے زیادہ قریب ڈاکٹر قطایہ کے رہا تھا!

آج میرے اجلاس کے مقررین یہ تھے:

ڈاکٹر راجر ارنالڈیز — یہ میرے پُرانے دوست ہیں۔ دوبار پاکستان ہمدرد کے مہمان کی حیثیت سے آچکے ہیں۔ پیرس میں مَیں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ "ہمدرد اِسلامیکس" کے وہ مشیر بھی ہیں۔ فرانس کی جامعۂ سوربون میں شعبۂ اسلامی کے سربراہ ہیں۔

فادر جارج قنواتی — میرے دوست ہیں۔ بارہا میں ان کے ڈومینی کن انسٹی ٹیوٹ قاہرہ میں گیا ہوں۔ فادر ایک بار پاکستان ہمدرد کے مہمان کی حیثیت سے آچکے ہیں۔ دوبارہ بھی آئے اور اب ستمبر سنہ ۱۹۷۹ میں مابعد الطبیعیاتِ ابنِ سینا پر چار لیکچرز دینے آئیں گے۔

ڈاکٹر کومیلوالفاریس ڈی موراليس (اسپین)، ڈاکٹر احمد عروق (الجزائر)، ڈاکٹر عبداللہ عدلی (مصر)، پروفیسر محمد فواد عنتابی (حلب)، ڈاکٹر محمد زہیر البابا (شام)، ڈاکٹر احمد بیومی السالح (کویت)، ڈاکٹر قسطنطین بالدس (یونان)، پروفیسر ڈاکٹر لویس کوسیا بالیستر (اسپین)۔

آج جمعہ ہے اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں باوجودیکہ سفر میں ہوں، نمازِ جمعہ ادا کروں گا، ظہر نہیں پڑھوں گا۔ میں نے اپنا جلسہ ایک بجے ختم کردیا۔ باہر آیا تو لاؤڈ اسپیکر پر تکبیر کی آواز آئی، مگر امام صاحب نے سورۂ والضحیٰ اور سورہ الم نشرح پڑھ کر نماز منٹوں میں ختم کردی۔ انڈیا کے جناب ڈاکٹر ورما صاحب ساتھ تھے۔ ان کو میری بے چینی کا پُورا اندازہ ہوگیا۔ وہ بڑی عجلت سے سمپوزیم کے دفترِ انتظام میں گئے اور میرے لیے کار کا انتظام کرادیا۔ ڈرائیور مجھے حسبِ ہدایت جامع الروضہ لے گیا، جہاں امام صاحب بڑے زور شور سے خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔ الحمدُللہ میں نے نمازِ جمعہ یہاں بڑے اطمینان سے ادا کرلی ہے۔ بڑی شان دار مسجد ہے اور بہ کثرت نمازی، سینکڑوں موٹریں۔ دل خوش ہوگیا۔

آج عراق کے پروفیسر صالح احمد العلی صاحب سے تفصیلی باتیں ہوئیں۔ وہ مجھ سے ملاقات چاہتے تھے۔ میں ان کی تلاش میں تھا۔ اتفاق سے ریستوران میں اُن سے ملاقات ہوگئی۔

پروفیسر علی، مرکز احیا التراث العلمی العربی عراق کے صدر ہیں۔ ان کے پاس کتاب الصیدنہ (البیرونی) نہیں ہے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں یہ کتاب ان کو بھجوا دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ عراق میں ان دنوں بہت زیادہ علمی کام ہو رہے ہیں۔ اس میدان میں ایک زبردست بیداری پائی جاتی ہے۔ گزشتہ سال اکتوبر میں مجھے بغداد میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ میں انجمن مؤرخین عرب کی دعوت پر یہاں ٹوئن بی کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اس کانفرنس میں دنیا کے منتخب علمائے تاریخ شریک ہوئے تھے۔ میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ وہ مقالہ ٹوئن بی پر ضرور تھا، مگر میرا مقالہ درحقیقت تمام عراق سے استفسار تھا کہ کل اس سرزمین پر رسولِ عربیؐ نے کیا درس دیا تھا اور ہم آج کہاں ہیں؟ میرے مقالے کے بارے میں صدر کی رائے تھی، "عجیب، حیرت انگیز، خوب"۔ یہ الفاظ مجھ تک میرے دوست پروفیسر محمود زید صاحب نے پہنچائے کہ جو امریکن یونی ورسٹی بیروت میں تاریخ کے اُستاد ہیں۔ اس کے بعد بغداد ٹیلی وژن نے اور بغداد ریڈیو نے اس کو نشر کیا۔ اخبارات میں شائع ہوا۔ تبصرے ہوئے۔ بقول نگرانِ شعبۂ اُردو بغداد ریڈیو، "حکیم سعید نے بغداد میں آگ لگا دی ہے"۔ طلبہ نے مجھے گھیر لیا۔ بغداد یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے بھی بغل گیر ہو کر پیار کیا۔ مجھے اس وقت صحیح اندازہ ہوا کہ حقائق کو تسلیم کرنے کی یہاں کس درجہ صلاحیت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عراق ان دنوں غیر ملکی دباؤ میں ہے اور اس کی فکری توانائیاں آزاد نہیں ہیں، بایں ہمہ لوگوں کے دلوں سے اسلام کی محبت کو ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ایسی کوششیں اگر جاری رہیں تو ان کا شدید ردِ عمل ہوگا۔ اس قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ پاکستان میں ہو چکا ہے، ایران میں ہوا ہے اور افغانستان آج بھی طاغوتی طاقت سے پنجہ کش ہے۔

عراقی علما سے ملاقاتوں میں یہ تاثر ضرور قائم ہُوا ہے کہ وہاں علمی فضا اچھی ہے، مگر یہ صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ علم جو چھپ رہا ہے اور نشر ہو رہا ہے اس کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر احمد العلی صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اب عراق کا خصوصی دَورہ کروں اور بذاتِ خود حالات کا مطالعہ کروں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کر دیا ہے۔ میں نے بھی ان کو پاکستان آنے کی دعوت دی ہے، مگر انھوں نے بتایا کہ دعوت نامہ براہِ راست نہیں وزارتِ خارجہ کے ذریعہ سے آنا چاہیے۔ میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ پاکستان میں بھی ایسا ہی ضابطہ ہے اور ہم اس کا احترام کرتے ہیں۔ ہندُستان (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کے پروفیسر مختار الدین صاحب آج پہنچے ہیں۔ ان سے تفصیل کے ساتھ باتیں کی ہیں۔ وہ عربی زبان میں اسلامیات پر ایک بڑا اچھا رسالہ نکالتے

ہیں۔ شام سے اُن کے رَوابط ہیں۔

دن کا کھانا آج حلب کلب میں جناب وزیرِ دفاع کی جانب سے تھا۔ بڑا پُرتکلف کھانا تھا۔ مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں اچھا ہے کہ ناشتے کے بجائے پورا کھانا کھالوں۔ میں نے بالآخر یہ مشورہ قبول کرلیا ہے اور اطمینان سے کھانا کھالیا ہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ جناب وزیرِ دفاع نے کل جو تقریر کی ہے اچھا تھا وہ تقریر آج وہ کرتے کہ شاید یہ برمحل ہوتی۔

پانچ بجے شام کا سیشن شروع ہوا اور رات کے ۹ بجے ختم ہوا۔ ہوٹل آکر مَیں اپنے کمرے میں آگیا۔

محفلِ فنیؔ

آج شب محفلِ فنیؔ نقابہ الفنانین حلب کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی۔ میرا ارادہ اس میں جانے کا نہ تھا مگر پروفیسر مختارالدین صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ پروگرام اچھا اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔ میں نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ "سماعت گاہِ فنون" ہوٹل سے قریب ہی تھی۔ بسیں جاچکی تھیں۔ میں اور ڈاکٹر سُہیلہ اور ایک منتظمہ واستقبالیہ کا کارکن پیدل روانہ ہوگئے اور جلد ہی پہنچ گئے۔ یہ کوئی ایسی بڑی جگہ نہ تھی۔ بھڑک دار بھی نہ تھی، اس لیے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ پروگرام کا معیار وزن دار ہوگا۔ مَیں درمیانی نشستوں میں بیٹھ گیا۔ یہاں ہندوستان کے مسٹر لال اپنی شریمتی جی کے ساتھ براجمان تھے۔ معلوم ہُوا کہ جامعۂ حلب میں اناٹومی کے پروفیسر ہیں۔ ان کو میں نے سمپوزیم میں نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں ڈاکٹر احمد یوسف الحسَن صاحب صدر جامعۂ حلب نے دیکھ لیا اور انھوں نے اصرار کرکے صفِ اوّل میں بُلالیا۔ ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری مسز حسَن کے پاس بیٹھ گئیں۔ یہاں ایک پُرانے دوست مل گئے، ڈاکٹر فواد سیزگین! ڈاکٹر حسَن صاحب کو اندازہ نہ تھا کہ مَیں اس شخصیت کا پُرانا دوست ہُوں۔ ڈاکٹر فواد سیزگین اسلامی سائنس کی ببلیوگرافی تیار کررہے ہیں۔ یہ اس قدر اہم اور بنیادی کام ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ چند سال ہوئے ڈاکٹر فواد سیزگین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں انڈیا کی لائبریریوں سے حوالہ جات کا انتظام کروں۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ رام پور لائبریری، خدابخش لائبریری پٹنہ اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں خود آکر کام کریں۔ وہ اس کے لیے تیار ہوگئے۔ میں نے ان کے سفر وغیرہ کا پورا انتظام کرادیا تھا۔ ان کا کام جاری ہے۔ تین یا چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

آج فواد سیزگین صاحب سے ملاقات بڑی اچانک ہوئی۔ ہم کافی باتیں کرتے رہے۔ محفلِ فنیؔ میں میرے بائیں جانب ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ صاحب تھے، دائیں جانب ڈاکٹر فواد سیزگین۔

میں ان دو عظمتوں کے درمیان تھا اور مسرور تھا۔ میں ایسے ہی علمی ماحول میں خوش رہتا ہوں کہ جہاں نہ سیاست ہو اور نہ ریاکاری۔ زندگی کے یہ چند لمحات خوب رہے۔

محفلِ فنی مجموعی حیثیت سے دل چسپ رہی۔ طلبہ نے اچھا پروگرام مرتب کیا تھا۔ ایک پروگرام قدیم روایت پر مشتمل تھا کہ بچہ جب حافظِ قرآن ہوتا تھا تو گھر والے اور اہلِ محلہ کس طرح جشن منایا کرتے تھے۔ برصغیر ہند و پاک میں بھی یہ روایت تھی کہ ختمِ قرآن پر جشن منایا جاتا تھا۔ مجھے اپنا جشنِ حفظِ قرآنِ کریم یاد آیا۔ میں نے پونے نو سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کرلیا تھا۔ سات سال کی عمر میں پہلا حج کیا تھا جو آج تک یاد ہے۔ واللہ کیا سفرِ حج تھا۔ علوی جہاز سے گئے تھے، خسرو سے واپس آئے تھے۔ چھے ماہ میں یہ مبارک سفر ختم ہوا تھا۔ مکۃ المکرمہ سے مدینہ منورہ جانے میں تیرہ دن لگے تھے۔ سارا سفر اونٹوں پر ہوا تھا۔ میں نے پہلی تراویح تیرہ سال کی عمر میں سُنائی، مسجد حوض قاضی دہلی میں۔ جس دن ختمِ قرآن ہُوا اُس دن میری والدہ محترمہ اور بھائی جان محترم نے تانبے کی طشتریاں بنوائی تھیں۔ ان میں بالوشاہی رکھوائی تھی۔ سینکڑوں لوگوں کو مٹھائی تقسیم ہوئی تھی۔ اس ختمِ قرآن کی دھوم دُور دُور تھی۔ تانبے کی یہ ایک طشتری اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

رات ساڑھے بارہ بجے محفلِ فنی ختم ہوئی۔ ہوٹل آتے آتے ایک بج گیا۔

۷۔ اپریل سنہ ۱۹۷۹ء، ہفتہ

انقلابِ ایران کے بارے میں آج ڈاکٹر مہدی محقق سے اس حوالے سے بات ہوئی کہ ڈاکٹر سید حسین نصر صاحب کا کیا ہوگا؟ وہ علمی دُنیا میں عالمی شہرت رکھتے ہیں وہ بڑے اچھے محقق اور اچھے مقرر ہیں۔ ان کو ایران میں وہ سہولتیں میسّر رہی ہیں کہ ایران کا دوسرا کوئی عالم ان کا ہم سر نہیں۔ آخر میں وہ شاہ اور شاہ بانو کے اتنے قریب ہوئے کہ اُن کے سفیر بن گئے اور عملاً وہ شاہ کے آدمی شمار ہوئے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اُن کا یہ قربِ شاہی علم و عالم کی قدر دانی میں ایزادی کے جذبۂ خالص سے تھا۔ اس قرب سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور علم و عالم کو بھی ان کی ذات سے فائدے پہنچے ہیں۔ بایں ہمہ ایران سے باہر جب بھی وہ اپنے علمی سفروں پر گئے اُن کے خلاف سخت مظاہرے ہوتے رہے اور اُن کے لیے یہ وجۂ پریشانی ہوئے۔ لندن میں جب ورلڈ اوف اسلام فیسٹول ہو رہا تھا تو اُن دنوں ڈاکٹر حسین نصر صاحب کی کوششوں سے اسلامی سائنس کی نمائش ہوئی۔ میں اس فیسٹول کا مشیر تھا اور اکثر معاملات سے میرا تعلق تھا۔ میری

رائے ہے کہ اسلامی سائنس کے لیے یہ پہلی کوشش تھی جس نے فکر کی لاتعداد راہیں کھول دیں۔ یہ ڈاکٹر حسین نصر کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس نمائش کا افتتاح ایران کی ملکہ فرح دیبا نے کیا۔ اس دن ایرانیانِ انگلستان نے ملکہ فرح کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ شاہ ایران کے ایرانی کس درجہ خلاف ہیں۔ ان مظاہروں کو طاقت سے نہیں دبایا جا سکتا تھا۔ البتہ اخبارات شاہِ ایران سے فیض یاب ہوتے رہے اور مظاہروں کی تشہیر زیادہ نہیں ہوتی تھی، اس مقصد کے لیے یورپ اور امریکا کے اخبارات کے لیے زبردست فنڈس موجود رہتے تھے۔

اب اندازہ یہی ہے کہ ڈاکٹر حسین نصر کبھی ایران واپس نہیں آسکیں گے۔ شاید وہ اِن دنوں لندن میں ہیں۔ کسی نے کہا امریکا میں دیکھے گئے۔ شاید وہ مستقلاً وہاں ہی رہیں گے کہ جہاں شاہِ ایران معزولی کی زندگی بسر کریں گے۔ ایک اچھے عالم کو اس طرح گھن لگ گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر حسین نصر علمی زندگی کو قائم رکھ سکیں گے اور امریکا اور یورپ کے وہ ادارے کہ جن کو حسین نصر کی وجہ سے ایرانی تعاونِ مالی حاصل رہا ہے ان کو علمی خدمت کے لیے راہ دیں گے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ آخری دنوں میں ڈاکٹر حسین نصر صاحب نے اپنے بہت سے دوستوں کو ناراض بھی کیا ہے۔ قُربِ شاہی نے اُن کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی تھی۔ میں نے اُن کی اس تبدیلی کو مکۃ المکرمہ میں کہ جب وہاں تعلیم اسلامی کانفرنس ہو رہی تھی، بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ نتیجے میں، مَیں نے اُن کو سلام کرنا چھوڑ دیا تھا جس کو انھوں نے شریف انسان کی طرح فوراً محسوس کر لیا اور اصلاحِ حال کر لی تھی۔ مَیں بہر حال ڈاکٹر حسین نصر کا قدردان ہُوں اور چاہتا ہوں کہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں کو اگر ممکن ہو تو جاری رکھیں اور ایسی زندگی اختیار کر لیں کہ جیسی کم و بیش ہر عالم گزارتا ہے۔

میں نے ڈاکٹر محقق سے یہ باتیں تو کر لیں، مگر مجھے آج بڑی شدت کے ساتھ اس کا احساس ہوا ہے کہ خود میں اس حال میں ہوں۔ کیا میرا مشیرِ طب ہونا ایسی ہی نوعیت رکھتا ہے کہ جیسا ڈاکٹر حسین نصر کا قُربِ شاہی۔ میں نے اپنے اس حال پر آج پہلی بار اس پہلو سے غور کیا ہے اور بڑا فکر مند ہوں۔ گو میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے یہ راہ صرف اور صرف طب کی خاطر اختیار کی ہے، مگر اس کے باوجود میرا دل آج غیر مطمئن بھی ہو گیا ہے۔

میں اپنی نئی پوزیشن کو یہاں اہلِ علم سے چھُپا رہا ہوں۔ واقعی ایک سچے عالم کے لیے یہ مقام ذرّہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مجھے آج پہلی بار محسوس ہوا اور بڑی شدت کے ساتھ کہ میں نے اپنے علمی مقام کو شاید گرا لیا ہے۔

اگر صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو اس قسم کے مسائل ان حالات میں پیدا ہوا کرتے ہیں کہ جب عالم کی قدردانی کا فقدان ہو اور علم کی ترقی کا سامان ہونا موقوف ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں میں بعض عالم گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں، مگر بعض عالم اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہیں اور قدردانیِ عالم اور علم کی ترقی کے لیے حاکم کی توجہ کو ضروری قرار دے کر اُن کے قریب ہو جاتے ہیں۔ ایران میں یہ صورتِ حال بہت زیادہ شدید نہ تھی، مگر ڈاکٹر حسین نصر جن راہوں پر چل کر علم کے دروازوں کو کھولنا چاہتے تھے اُن کے لیے قُرب شاید ضروری تھا۔ امپیریل انسٹی ٹیوٹ اوف فلاسفی کو وہ جس نصف النہار پر لے جانے کے لیے بے چین تھے اس کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ اپنے اثرات اور رسُوخ کو استعمال کریں اور قُربِ شاہی کی وجہ سے مالی مسائل کو کلیتہً حل کر ڈالیں۔ علمی دنیا میں ان کا مقام متعین ہو چکا تھا اور اُن کو عالمی تعریف اور تعارف کی حاجت نہ تھی، لیکن کوئی کام ایسا کر ڈالنے کے لیے کہ جو اُن کو دوام بخشے اور علم کے سوتے خشک نہ ہوں اُن کو قربِ شاہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر حُسین نصر کے بارے میں مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کو اس سے زیادہ حاجت تھی نہ ضرورت۔ بایں ہمہ ایران کے ایک انقلاب نے ان کو مجروح اور مضروب کر ڈالا ہے اور کوئی یہ سُننے کو تیار نہیں ہوگا کہ اس عالم کا قربِ شاہی ذرّہ برابر سیاسی نہ تھا۔ قربِ شاہی اُن کے لیے اس حد تک تکلیف دہ ہے کہ وہ اب شاید اپنے وطن کبھی نہ آسکیں۔ علامہ آیت اللہ رُوح اللہ خمینی صاحب خود شاہِ ایران کی وجہ سے جلا وطن رہے ہیں۔ وہ جلا وطنی کی تکلیف کو خود جانتے ہیں۔ اگر جلا وطنی شاہِ ایران کے لیے وجہ طمانیت ہے تو اُن کو ضرور ڈاکٹر حسین نصر جیسے عالم کی قدردانی کرنی چاہیے اور اُن کے لیے مسدُود راہوں کو کھول دینا چاہیے۔ اس وقت ایران میں جو صورتِ حال ہے وہ کم تکلیف دہ نہیں ہے۔ خاصانِ شاہ کے ساتھ جو معاملہ وہاں ہو رہا ہے وہ شاید مبنی بر رحم و انصاف نہیں ہے۔ درجنوں ایسے لوگ تختۂ دار پر چڑھائے جا رہے ہیں کہ جو کسی نہ کسی درجے میں مناصبِ بلند و جلیل پر فائز تھے اور تابع فرمانِ شاہی تھے۔ اطاعتِ حکمِ شاہی اُن کا فرض تھا، مگر آج یہی اُن کا قصور ہو گیا ہے اور اس نے ان کو تختۂ دار پر چڑھا دیا ہے۔ ابھی نہ جانے ایران میں کتنے لوگ اور اس طرح نذرِ دار ہوں گے۔

میرا ذاتی تاثر یہ ہے اور میں اس کو ظاہر کر دینے سے گریز نہیں کروں گا کہ موجودہ صورتِ حال کسی ایک اور خونی انقلاب کا پیش خیمہ نظر آتی ہے۔ علماء مجتہدین کی جو ایرانی انقلابی اسلامی کاؤنسل حامیانِ شاہ کے قتل کے فیصلے صادر کر رہی ہے کل یہی حالات اس کے لیے پیدا ہونے کے قوی امکانات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ایران کا انقلابِ اسلامی انتہائی ہمت افزا ہے۔

دنیائے اسلام نے اس انقلاب کا خیر مقدم کیا ہے اور پاکستان نے اس راہ میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے اور درحقیقت جب صدرِ پاکستان نے خیر مقدم کیا ہے تو انھوں نے پاکستان کے ہر دل کی دھڑکن ایران اور اہلِ ایران کو سُنائی ہے۔ بایں ہمہ اس انقلابِ اسلامی میں شانِ اسلامی کو برقرار رکھنے کی صفت ہونی چاہیے۔ ہم نے حال ہیں تجربات کیے ہیں۔ جمال عبدالناصر نے مصر میں انقلاب لانے کے بعد اخوان المسلمین کا صفایا کر کے مصر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیادتِ اسلامی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم مصر کا حال آج دیکھ رہے ہیں۔ افغانستان میں یہ صورتِ حال ہنوز جاری ہے۔ وہاں اہلِ اسلام کا قتلِ عام جاری ہے۔ نہ جانے کتنے علما و فضلا تختۂ دار پر چڑھائے جاچکے ہیں اور گولیوں سے اُڑائے جاچکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ عراق اور شام میں جو انقلاب آرہے ہیں وہ اسلام کی سربلندی کے نقیب نہیں ہیں۔ ایران کو ایسے انقلابات کی لپیٹ سے باہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایران میں جو صورتِ حال ہے اس سے ملی ضعف پیدا ہوسکتا ہے اور کل اس کے نتائج سنگین ہوسکتے ہیں۔ اِس لیے توازن و اعتدال کے لیے یہ موزوں ترین وقت ہے۔ عدل و اعتدال سے انقلابِ اسلامی کو دوام حاصل ہوسکتا ہے اور بے اعتدالی اہلِ اسلام کے لیے مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں انقلابِ اسلامی کے لیے جو اقدامات ہو رہے ہیں اُن کو ایران کے انقلابِ اسلامی نے تقویت پہنچائی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پاکستان کی مثال نے ایران کی ہمت افزائی کی ہے۔ ان دونوں ممالک میں ایک مضبُوط اور دائمی انقلابِ اسلامی نہ صرف یہ کہ افغانستان کو طاغوت کی گرفت سے نکال سکتا ہے بلکہ سنٹرل ایشیا میں اسلام کی طاقت کو برسرِ عمل کر سکتا ہے اور اسرائیل کی شکست یقینی ہوسکتی ہے۔ اور دُنیائے عرب درپیش خطرات کی گرفت سے آزاد ہوسکتی ہے اور برِصغیر میں ایک پائدار اسلامی انقلاب بپا ہوسکتا ہے۔ یہ وقت ہے کہ جنرل محمد ضیاءُ الحق اور آقائے آیت اللہ رُوح اللہ خمینی قریب تر ہو کر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا سامان کریں۔

میں نے آج صبح سے سہ پہر تک تمام وقت کلیتہ الطب میں صَرف کیا اور علما کے مقالات کو نہایت اطمینان سے اور توجہ سے سُنا اور بڑا اطمینان محسوس کیا۔ میری جدّوجہد کا نقطۂ فکر یہ رہا ہے کہ طب کے ذیل میں فکری انقلاب مغرب میں برپا کرنا ضروری ہے۔ مَیں گزشتہ مسلسل کئی سال سے امریکا اور یورپ میں تبلیغِ طبِ فطری کر رہا ہوں۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ سب سے پہلے فکرِ مغرب کی اس طاقت کو زیر کرنا چاہیے کہ جس نے اپنی برتری کی بنا پر مشرق، ایشیا و افریقہ کے

اذہان کو اپنے علوم وفنون کی حفاظت اور اپنی تہذیب وثقافت کی قدردانی سے محروم کردیا ہے۔ طبِ مشرقی کو دَبا کر طبِ مغربی کا عَلم قلبِ ایشیا میں بلند کردیا ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو پھر مشرق اپنی فکر میں آزاد ہوجائے گا اور یہاں سے ایک بار پھر علم وحکمت کی روشنی پھیلے گی۔ الحمدُ للہ اب یہ وقت آگیا ہے۔ سمپوزیم تاریخ عربک سائنس میں عرب اور غیر عرب، مُسلم اور غیر مُسلم، مغربی اور مشرقی سب کے سب طب کے بارے میں اپنی فکری تخلیقات پیش کررہے ہیں اور مَیں بے حد خوش و بے اندازہ مسرور ہوں کہ اب مزاج، ارکان اور اخلاط اور طب کے اصول ونظریات پر عالمی سطح پر غور وفکر اور بحث ومباحثہ ہورہا ہے۔ اب علم وحکمت کا رُخ بدل رہا ہے۔ ساری دنیا میدانِ طب میں جدّت طرازی اور جدّت سے تنگ آکر آغوشِ فطرت میں آنے کے لیے بے چین ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری زندگی کا یہ مشن اس طرح پورا ہورہا ہے۔ اَب بس دُکھ ایک رہ گیا ہے کہ پاکستان نے اس ہَوا اور فضا کو ہنوز قبول نہیں کیا ہے۔ پاکستان میں صدرِ مملکت نے طب کے لیے راستہ ہموار کردیا ہے۔ مگر اُسی دن سے پاکستان مَڈیکل ایسوسی ایشن اور اس کے ہم نوا آمادہ پیکار ہیں۔ ایسوسی ایشن نے سائنسی انداز کو قطعی نظرانداز کردیا ہے اور طبی اخلاق کو پامال کرکے رکھ دیا ہے۔ اسے یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ طب کو اسلامی کہا جائے۔ دُنیا اب جس طب پر ازسرِ نو غور وفکر کررہی پاکستان مَڈیکل ایسوسی ایشن اس کو اتائیت کہنے میں نہ تامل کرتی ہے اور نہ شرم محسوس کرتی ہے۔

اگر پاکستان کی وزارتِ صحت گزشتہ تیس سال تک اپنی فکری کج رفتاری میں مبتلا نہ ہوتی اور اس کی وجہ سے پاکستان مَڈیکل ایسوسی ایشن اور اس کے ہم جنس اور ہم نوا ادارے عقل و خِرد کو کام میں لاکر علم وحکمت کے میدانوں میں مَردانہ وار قدم رکھتے تو کئی میدان ایسے تھے کہ جہاں پاکستان کو اوّلیت کا مقام نصیب ہوتا، مگر یہ وقت تو کھو دیا گیا ہے۔ اور اب بھی جو کام کرنے کا ہے اس سے آنکھیں بند کرکے فقط فنّی تعصبات کی بنیادوں پر اقدامات ہورہے ہیں اور راہِ طب میں مشکلات پیدا کی جارہی ہیں۔ درحقیقت یہ نہ تو علم وحکمت ہے اور نہ علمی اور فنّی اندازِ فکر ہے۔ اس کو فقط جہل کا نام دیا جاسکتا ہے اور اب پاکستان کے اہلِ طب اس صورتِ حال کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رہنے دیں گے۔ میں نے گزشتہ کئی سالوں سے برابر یہ کہا ہے کہ دنیائے طب میں ایک انقلاب آکر رہے گا اور موجودہ جراثیم کُش ادویہ (اینٹی بایوٹکس) دَم توڑ دیں گی۔ انسان کو فطرت کی جانب بہرحال آنا ہوگا۔ میری رائے صحیح ثابت ہوئی۔ انقلاب نے طب و سائنس کے دروازوں پر بڑے زور سے دستک دے دی ہے اور اہل فضل وکمال نے تازہ فضا کے لیے دروازے کھول دیے ہیں۔ یہ بے چاری پاکستان مَڈیکل ایسوسی ایشن کس شمار میں ہے اور کس

قطار میں ہے۔ اس کے مبنی بر تعصب و جہل افکار اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

میں نے اپنی سہ پہر آج بعض علمائے طب سے تبادلِ خیال میں صرف کی۔ ہمدرد اکیڈمی نے بڑے اہتمام کے ساتھ میرا مقالہ برن یونی ورسٹی چھاپ دیا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں برن یونی ورسٹی (سوئٹزرلینڈ) نے مجھے "اسلام اور مغرب" سلسلۂ تقاریر میں تقریر کی دعوت دی تھی اور موضوع دیا تھا: طبِ یونانی/عربی اور طبِ جدید ——— اتفاق رائے یا اختلاف۔ میرے اس مقالے کو جامعۂ برن نے بھی چھاپا ہے۔ اب ضرورت کے مطابق ہمدرد اکیڈمی نے بڑے اہتمام سے چھاپا ہے۔ میں نے مقالہ یہاں بعض اہم شرکا کو دے دیا ہے اور ان کو دعوتِ فکر دی ہے۔ میں نے مؤتمرین میں سے بعض کو اوسٹریلیا میں اس سال (۲ تا ۸ ستمبر) ہونے والی عالمی ایشیائی طبی کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار کر لیا ہے۔ ان کو اب باضابطہ دعوت نامے کنبرا یونی ورسٹی اوسٹریلیا سے جاری کراؤں گا۔ اس عالمی طبی کانفرنس میں میں پاکستان سے ایک مضبوط وفد لے جانے کا سامان کر رہا ہوں اور میں نے یہ انتظام بھی کیا ہے کہ ہندستان سے بھی ایک مضبوط وفد جائے۔ یہ کانفرنس تاریخ ساز ہوگی۔ مجھے بس دکھ اس بات کا ہے کہ اِس کانفرنس کو پاکستان میں ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہماری وزارتِ صحت کا مزاج ایشیائی نہ تھا مغربی تھا۔ اگر پاکستان میں طب کے لیے سالِ گزشتہ وہ حالات پیدا ہو جاتے کہ جو آج ہیں تو اس میدان میں پہل میرے ذریعہ سے پاکستان میں ہوتی۔ میں نے سنہ ۱۹۶۲ میں ایسی کانفرنس کا خواب دیکھا تھا اور پھر میں نے ملک کے اہل الرائے کو خطوط بھی لکھے تھے۔ آج میں اس فائل کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی اس رائے پر مسرت ہوتی ہے اور اطمینان کہ طب کی دُنیا میں انقلاب آئے گا۔ رنج یہ ہے کہ میں پاکستان کو اس کا نقیب بنانا چاہتا تھا مگر یہ نہ ہو سکا۔ بہرحال مجھے یہ اطمینان ہے کہ اوسٹریلیا کے بعد اب سنہ ۱۹۸۰ میں اور ۱۹۸۱ میں کویت اور الجزائر میں عالمی طبی اسلامی کانفرنسیں ہوں گی۔ میں ان دونوں مقامات کے لیے پلاننگ کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد طب کو عالمِ انسانیت کے دکھ کا درماں بنا دیا جائے گا اور انسان آغوشِ فطرت میں سکون کا سانس لے سکے گا۔

۸ راپریل ۱۹۷۹ء، حلب (شام)

موسم بہت اچھا ہے، گرمی نہیں ہے۔ رات کو کمبل اوڑھا جا سکتا ہے۔ ماحول بڑا ہی خوش گوار ہے، ایسا ہی خوش گوار ہے کہ جیسا تمدنِ اسلامی میں تصور ہو سکتا ہے۔ طب اور سائنس کے مورخین کا

ایسا حسین اجتماع کم ملتا ہے۔ موتمرین میں سے زیادہ تر شخصی طور پر مجھ سے واقف ہیں اور میں ان کا دوست ہوں۔ بہت سوں سے غائبانہ تعارف حاصل ہے۔ آج شکاگو کے ڈاکٹر ایلن دیبوس نے اپنا تعارف کرایا۔ جامعۂ شکاگو میں شعبۂ تاریخِ طب و سائنس کے سربراہ ہیں۔ ممنون تھے کہ میں نے اُن کو ہمدرد اسلامیکس اور ہمدرد میڈیکس بھجوایا تھا۔ ان کا موضوعِ فکر "کیمیا میں مسلمان علما کا کردار ہے۔" یہاں سمپوزیم میں اُن کا موضوعِ خطاب تھا:

THE JEBER TRADITION IN WESTERN
ALCHEMY AND CHEMISTRY

مَیں نے اُن سے اسلام اینڈ سائنس کے موضوع پر تبادلِ خیال کیا، اور خصوصیت کے ساتھ اس لیے کہ مَیں ایسے آدمیوں کی تلاش میں ہوں کہ جو اسلام کے چودہ سو سال اور سائنس پر تاریخی اور علمی کاموں میں مدد دے سکیں۔ ۱۵ ویں صدی کے آغاز کے موقع پر میں جس بین الاقوامی سائنسی اجتماع کا تصور رکھتا ہوں وہ اس میدان میں یکسر فکری انقلاب کا ضامن ہوگا۔ میں نے اُن کو دعوت بھی دی ہے کہ اپنے فیلڈ میں وہ پاکستان میں چار لیکچر دیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ کراچی میں امریکن کلچرل ڈویژن کو میں اُن کو بلانے پر متوجہ کروں گا اور پاکستان میں ان کی میزبانی کا شرف حاصل کروں گا۔

آج ڈاکٹر ڈیوڈ کنگ سے علاحدگی میں تفصیل سے باتیں کی ہیں۔ وہ کئی بار کہہ چکے تھے کہ اطمینان سے بات کرنی ہے۔ وہ میقات اور سمتِ قبلہ، اوقاتِ نماز کے علم پر ماہرانہ صلاحیت کے حامل ہیں، بلکہ اس موضوع پر اور اس میدان میں سب سے پہلے عالم ہیں کہ جو عربی مخطوطات کے غائر مطالعے کے بعد علمائے قدیم کے کمالات اور ان کی اس میدان میں جدّ و جہد اور پیش رفت کو روشنی میں لائے ہیں میں ۱۹۷۷ء استنبول (ترکی) میں اس موضوع پر لیکچر سُن چکا ہوں، پھر قاہرہ (مصر) میں ان کے مرکزِ تحقیق میں وقت گزار چکا ہوں اور اب یہاں بھی ان کے لیکچر کو مَیں نے بڑے غور سے سُنا ہے۔ ڈاکٹر کنگ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ ان کو پاکستان بلا کر ان سے اہلِ علم کے لیے استفادہ کا سامان کیا جانا چاہیے۔ میں نے ان کو دعوت دی ہوئی ہے۔ میں نے قاہرہ میں بھی اُن سے درخواست کی تھی اور ان کو آج پھر مشورہ دیا ہے کہ وہ میقات پر ایک کتاب تیار کر دیں جس کو ۱۵ ویں صدی کی تقریبات کے موقع پر شائع کیا جا سکے گا۔ ڈیوڈ کنگ نے ابنِ یونس پر اہم تاریخی کام بھی کیا ہے۔ مسز کنگ نے مجھے بتایا کہ یہ کام تیار ہے۔ مَیں نے اُن سے کہا ہے کہ وہ تفصیلات مجھے بھجوا دیں۔

پاکستان ہنوز تیاری و طباعتِ کتب میں دُنیا میں کوئی متعین مقام نہیں رکھتا ہے، اس لیے مصنفین کہ جو عالمی سطح کے ہیں وہ اپنے کام کو پاکستان کے حوالے کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پاکستانی ناشرین نے اپنا مقام بلند کیا ہے نہ اُن کے عالمی روابط ہیں کہ کتابیں تیار ہوں اور دُنیا میں پھیل جائیں۔ پاکستان

کے بعض ناشرینِ کتب بلاشبہ یہ درجہ رکھتے ہیں کہ وہ عالمی سطح پر کام کریں، ان کا معیارِ طباعت عالمی سطح پر قابلِ قبول ہو سکتا ہے، مگر اُن کی توجہات اس جہت میں مبذول نہیں ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انٹرنیشنل کنگرس اوف اورینٹالسٹس ۱۹۷۳ء میں پیرس میں ہوئی تو اس موقع پر دنیا بھر کے ناشرینِ کتب نے اپنی کتابوں کی نمائش و فروخت کی، مگر پاکستان وہاں غیر حاضر تھا۔ اس طرح کئی برس ہوئے فرینکفرٹ کے عالمی میلۂ کتب مجھے جانے کا اتفاق ہُوا۔ پاکستان وہاں بھی غیر حاضر تھا، جب کہ ہزاروں کی تعداد میں ناشرینِ کتب نے ساری دُنیا سے آکر اپنے اسٹال لگائے تھے۔ بین الاقوامی تعارف کے میدان یہی ہوا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ خوب جانتے ہیں کہ ابن الہیثم پر میں نے کام شروع کیا ہے اور میں نے ہی اُن کو کتاب المناظر از ابن الہیثم کے ترجمہ انگریزی کے لیے راہ دی اور پھر میں لندن وارزبرگ انسٹی ٹیوٹ میں اُن کے پاس جاتا رہا اور جب وہ ہارورڈ یونی ورسٹی امریکا چلے گئے تو تین بار میں اُن کے پاس گیا اور ترجمے کو دیکھتا رہا۔ کتاب المناظرہ کے ترجمۂ انگریزی کے لیے ہارورڈ یونی ورسٹی پریس کے منتظمین سے ملا اور اس کی اشاعت پر بات کی۔ میں نے اُن کو ۲۵ ہزار رُپے اعانت کی پیش کش بھی کی تھی اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے بجٹ میں یہ رقم رکھ بھی دی تھی۔ بایں ہمہ ڈاکٹر صبرہ کا مزاج یہ ہے کہ پاکستان میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اب لندن کا ناشر ایک سال سے اُن کا مسودہ دبائے بیٹھا ہے۔ مَیں نے اُن سے آج یہ کہہ دیا ہے کہ لندن کے ناشر کو اگر مالی دشواری ہے تو اس سے ہمدرد تعاون کر سکتا ہے اور آدھی رقم لگا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں طباعت کے بعد افریشیا کے لیے ہمدرد آدھی کتابیں لے لے گا اور حقوقِ فروخت بھی۔

جامعۂ حلب کے کلّیۃ الزّراعت میں عراق کی ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری نے نباتات پر ایک لیکچر دیا۔ اس لیکچر میں ہمدرد کا ذکر بار بار آیا اور حکیم سعید کا کئی بار حوالہ۔ ڈاکٹر سُہیلہ میری منھ بولی بہن ہیں۔ جامعۂ بغداد میں آثاریات کی پروفیسر ہیں اور خطاطی کی تاریخ اور طرز پر ایک بہترین کتاب کی مصنّفہ ہیں۔ بہن بھائی کی داستان بڑی دل چسپ ہے۔ ۱۹۷۵ء میں قاہرہ یونی ورسٹی نے مجھے دعوت دی کہ اُن کے شعبۂ آثاریات (آرکیالوجی) کے جشنِ ذہبی (گولڈن جوبلی) میں شرکت کروں۔ میں نے صدر شعبۂ آثاریات محترمہ ڈاکٹر سُعاد ماہر کی دعوت قبول کر لی اور وہاں ایک ایسا دل چسپ مقالہ پڑھا کہ قاہرہ یونی ورسٹی میں اس کی وجہ سے بڑی دل چسپی پیدا ہو گئی۔ موضوع تھا ''آثاریات میں مقامِ طب۔ آثارِ قدیمہ میں آثارِ طب کی موجودگی، حنوط کردہ نعشوں میں آثارِ امراض، مقابر سے برآمد شدہ شہد اور گیہوں وغیرہ۔ قاہرہ یونی ورسٹی میں اس عالمی سمپوزیم کے اختتام کے بعد مصری آثار کی سیر بھی پروگرام میں شریک تھی۔

اس میں لکسر، آسوان میں ڈیم کا معائنہ وغیرہ شامل تھے۔ اِس میں یونیسکو نے تعاون کیا تھا۔ اس موقع پر آسوان ڈیم پر میری تحریک پر ابن الہیثم کی تختی لگانے کا دل چسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ ابن الہیثم پہلا شخص ہے کہ جس نے مصری زراعت اور اقتصادی خوش حالی کے لیے آسوان بند کا تخیل اور تصور پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری مادام سعاد ماہر کی شاگرد ہیں اور اُن کی بیٹی بنی ہوئی ہیں۔ میں جب وہاں تھا تو مادام سعاد نے میرے ساتھ بھی بیٹے جیسا سلوک کیا۔ اب سُہیلہ بیٹی اور میں بیٹا ظاہر ہے کہ سُہیلہ اور میں بہن بھائی ہوئے! ہے نا یہ داستان دل چسپ!

گزشتہ دنوں فروری ۱۹۷۹ ڈاکٹر سُہیلہ اور ان کے شوہر سلمان الرادی جو بغداد کے ایک بڑے مہندس (انجنیئر) ہیں دونوں پاکستان آئے تھے اور ہمدرد کے مہمان تھے۔ دمشق اور حلب میں گو میں جامعۂ حلب اور وزارتِ تعلیم العالی کا مہمان تھا، مگر ایسا لگتا تھا کہ ڈاکٹر سُہیلہ بہن ہی نہیں بڑی اماں بھی ہیں، اور میزبان بھی۔ سارے دورانِ قیام ڈاکٹر سُہیلہ نے جس قدر میرا خیال رکھا ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔ دُودھ میرا بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ میں صبح ناشتہ نہیں کرتا ہوں۔ دن کو لنچ کے وقت میرا ناشتہ ہوتا ہے۔ اُس وقت دودھ کی فراہمی مسئلہ ہوا کرتی ہے۔ یہاں ہوٹل ٹورسٹ (فندق السیاحی) میں لنچ کے وقت دودھ کا انتظام نہیں ہو سکتا، مگر ڈاکٹر سُہیلہ ہوٹل کے باورچی خانے میں خود جا کر دودھ پاؤڈر سے تیار کر کے لاتی تھیں۔ ان کا چار دن یہی معمول رہا۔ انھوں نے مجھے ایک پیسہ خرچ کرنے نہیں دیا ہے۔ حتیٰ کہ حلب تا دمشق ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی میرے لیے خرید لائیں۔ یہاں سمپوزیم میں وہ عربی میں میری مترجم کی حیثیت سے بھی کام کرتی رہیں۔ کئی مورّخینِ سائنس ایسے تھے کہ وہ صرف عربی جانتے تھے، مثلاً کلیتہ الطب کے سربراہ ڈاکٹر عبدالکریم شحادہ صرف عربی جانتے تھے۔ اُن سے تفصیلی تبادلِ خیال میں ڈاکٹر سُہیلہ ساتھ رہیں۔

میں نے ڈاکٹر سُہیلہ کا میدانِ فکر بدل دیا ہے۔ یہاں انھوں نے جو لیکچر دیا ہے وہ نباتیات پر تھا۔ اِس کے لیے ان کو میٹریل کراچی میں فراہم کر دیا گیا تھا۔ اپنے دورۂ کراچی، پشاور، اِسلام آباد اور لاہور میں ان کی توجہات نباتات پر مرکوز ہیں۔ اب میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اوسٹریلیا میں ہونے والی ایشین ٹریڈیشنل میڈیسن کانفرنس کے لیے نباتیات پر مقالہ تیار کریں۔ وہ اور اُن کے شوہر میرے ساتھ اوسٹریلیا جائیں گے۔

محترمہ نوشین خانم محقق اور ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری کو میں نے سیشن کے بعد اجازت دے دی کہ وہ سیرِ بازار کے لیے چلی جائیں۔ میں ہوٹل آ گیا۔ ظاہر ہے کہ دودھ کا انتظام آج ممکن نہ تھا۔ میں

نے کھانا چھوڑ دیا اور اپنے کمرہ ۳۱۶ میں آکر ذرا دم لیا۔ نمازِ ظہر ادا کی اور چار بجے تیار ہو کر پھر جامعۂ حلب پہنچ گیا۔

ابن النفیس

میرے عزیز دوست ڈاکٹر سلمان قطایہ نے مجھے اپنی تیار کردہ فلم کے چند نمونے صبح دکھا دیے تھے۔ قطایہ جامعۂ حلب کے شعبۂ طب میں اُستاد ہیں۔ وہ اور اُن کی اہلیہ میرے ساتھ بلغاریہ میں تھے، جہاں تاریخِ طب کی عالمی کانفرنس ہوئی تھی۔ (اگست ۱۹۷۸) بلاوَڈف اور صوفیہ میں اُن کا میرا بہت دن ساتھ رہا تھا۔ میرے نئے دوست ڈاکٹر عبدالکریم شحادہ ہیں جو امراضِ جلد کے پروفیسر بھی ہیں۔ تیسرے ایک پُرانے دوست ڈاکٹر نشأت حمارنہ ہیں جو جامعۂ دمشق میں پروفیسر بصریات ہیں۔ ان کو میں نے کینبرا یونی ورسٹی (اوسٹریلیا) میں طبّی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دلوادی ہے۔ وہ اس کے لیے ممنون تھے۔

ان تینوں دوستوں نے بڑی جاں فشانی سے ایک رنگین فلم ابن النفیس پر تیار کی ہے۔ اب ساڑھے چار بجے شام اس فلم (نیز ابلا اور مسلم تحقیقاتِ سائنس پر فلم) کی نمائش کا انتظام تھا۔ ہمدرد انڈیا کے جناب حکیم حاجی عبدالحمید کو یہ فخر حاصل ہے کہ لندن ٹائمز میں ابن النفیس پر یہ نوٹ شائع ہوا کہ دورانِ خون کا محقق ابن النفیس ہے، سر ولیم ہاروے کے سر یہ سہرا غلط باندھا گیا ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا اس انکشاف پر حیران ہو گئی اور متوجہ۔ بالآخر یہ بات پایۂ تحقیق و ثبوت کو پہنچ گئی کہ درحقیقت دورانِ خون کا انکشاف ابن النفیس نے پہلی بار کیا اور بعد کے انکشافات ابن النفیس کے خوشہ چیں ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ (شائع کردہ عالمی ادارۂ صحت، جینوا) نے بھی اِس حقیقت کا بالآخر اعتراف کر لیا۔ اب میرے ان تین دوستوں نے حوالہ جات کے ساتھ یہ رنگین فلم تیار کر دی ہے۔ بڑی دل چسپ ہے اور اس موضوع پر سب سے پہلی اور کام یاب کوشش ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر سلمان قطایہ ڈاکٹر عبدالکریم شحادہ اور ڈاکٹر نشأت حمارنہ مستحقِ مبارک باد ہیں۔

پانچ بجے شام فلموں کی نمائش شروع ہو گئی تھی۔ تینوں فلمیں (ابن النفیس، ابلا اور سائنس و مسلمان) بہت دل چسپ تھیں۔ سائنس اور مسلمان فلم کے ٹائیٹل پر ڈاکٹر عزّالدین ابراہیم صاحب کا نام دیکھا۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ فلم شام میں تیار نہیں ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابو ظہبی نے اس کی تیاری میں دل چسپی لی ہے۔ ڈاکٹر عزّالدین ابراہیم کو خط لکھوں گا۔ شاید یہ فلم انگریزی زبان میں بھی ہو گی۔ اگر ہوئی تو اس کی کاپی پاکستان کے لیے حاصل کروں گا۔ ڈاکٹر

عزالدین ابراہیم علمی دُنیا کی معروف شخصیت ہیں ۔ ابوظہبی کے سربراہ کے ثقافتی مشیر ہیں ۔ ان کے ساتھ وینس (اٹلی) میں مجھے رہنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ (۱۹۷۷) جب کہ میں "اسلام اینڈ دی ویسٹ" پروگرام میں پلاننگ کے سلسلے میں کام کر رہا تھا ۔ البندُقیہ (موجودہ وینس کا پُرانا نام کہ جو عربوں کے زمانے میں تھا) میں ایک عالمی میٹنگ سینی فاؤنڈیشن کی عمارت میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس میں بڑے اچھے لوگ جمع ہوئے تھے ۔ لارڈ کاریڈان (پارلیمان برطانیہ) صدر تھے ، وہ ان دنوں پرنسٹن یونی ورسٹی (امریکا) میں ہیں ۔ ڈاکٹر معروف الدوالبی صاحب بھی اس میں شریک تھے ۔ وہ شاہ خالد معظم کے مشیر ہیں ۔ اُن سے سب سے پہلی بار تعارف یہاں ہی حاصل ہوا ۔ کُل پینتالیس عالمی شخصیات تھیں اور ہم پروگرام یہ مرتب کر رہے تھے کہ مغرب میں اسلام کی صحیح فہم کیسے شروع کی جائے ۔ اس کے بعد دوسری میٹنگ پیرس میں ہوئی تھی جہاں میں نے پانچ ہزار ڈالر اور ڈاکٹر معروف الدوالبی صاحب نے دس ہزار ڈالر کی پیش کش کی کہ جینوا (سوئٹزرلینڈ) میں دفتر قائم کر کے کام شروع کر دیا جائے ۔ ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب بھی اس کام سے دل چسپی لیتے رہے ہیں اور اب وہ زیادہ مستعد ہیں ۔

میں نے فلم کے بعد ان تینوں سے آج تفصیل کے ساتھ تبادلِ خیال کیا ہے اور رات کو اس فلم کے ڈائریکٹر ، پروڈیوسر سے بھی بات کی ہے ۔ میں نے ان کو اس فلم کو انگریزی میں ڈب کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اُن سے کہہ دیا ہے کہ پاکستان کے لیے ایک کاپی ہمدرد ونیشنل فاؤنڈیشن خریدے گا ۔ پروفورما انوائس بھجوا دینے کے لیے ہدایت دے دی ہے نیز میں نے اُن سے کہا ہے کہ وہ انگریزی میں اس فلم کی ایک کاپی مجھے طبی کانفرنس اوسٹریلیا کے لیے بھی دے دیں ۔ میں نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ اوسٹریلیا میرے ساتھ چلیں ۔ میں اُن کی شرکت کے لیے رسمی دعوت نامے کا انتظام کروں گا ۔

مطالعۂ نباتات

حلب کے دو ماہرینِ طب ملکِ شام میں جائزۂ نباتات لینا چاہتے ہیں اور اس کام کے لیے اُن کو حلب یونی ورسٹی سے فنڈ کی ضرورت ہے ۔ مجھ سے شبِ گزشتہ صدر جامعۂ حلب ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب نے بات کی تھی ۔ میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ اس کام سے عالمی ادارۂ صحت ایسٹرن میڈی ٹرینین ریجن کو دل چسپی ہے ۔ میں وہاں سے فنڈس کے لیے انتظامات کی کوشش کر سکوں گا ۔ ان کے ماہرینِ طب سے میں نے آج ملاقات کی اور ان کے نقطۂ فکر کو سمجھ لیا ہے ۔ اب میں جناب محترم ڈاکٹر تابا صاحب کو اسکندریہ لکھوں گا اور شام میں جائزۂ نباتات کے کام کو آگے بڑھانے کی سعی کروں گا ۔ میں کل خود بھی بازارِ حلب میں نباتات فروشوں سے ملنے جاؤں گا ۔

آج عشائیہ محافظ (میئر) حلب کی جانب سے تھا۔ بڑا اچھا اجتماع تھا۔ یہاں میں نے اپنی میز پر ڈاکٹر احمد یوسف الحسن، پروفیسر خولو دولین (یونیسکو)، پروفیسر اِرکا مولا (فن لینڈ)، پروفیسر مہدی محقق (ایران)، پروفیسر سُہیلہ الجبُوری (عراق)، پروفیسر شرما (انڈیا)، پروفیسر الرّادی کو دعوتِ شرکتِ طعام دی تھی۔ یہ مجلس بڑی دل چسپ رہی۔ ڈاکٹر اِرکا مولا سے میری دوستی کی کہانی بڑی مزے دار ہے۔ اُن کا ایک خط آیا کہ جزائر فن لینڈ میں دنیا سے الگ تھلگ لوگ صدیوں سے رہتے ہیں۔ ان کی زندگیاں بس اسی طرح گزر جاتی ہیں کہ کوئی اُن کا پوچھنے والا نہیں ہے۔ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے اور اُن کو آج کی زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دینا چاہیے۔

میں نے ان کے اس خیال کی بھرپور تائید کی اور میں نے اُن کو لکھا کہ میں اس کا جائزہ لوں گا۔ جزائر میں یہ محبوس لوگ اپنا علاج کیا کرتے ہیں اور ان کی دوائیں کیا ہیں؟

ڈاکٹر اِرکا مولا نے ایک عالمی کانفرنس کا انتظام کر لیا۔ ایک بوٹ کرائے پر لینے کا فیصلہ کر لیا اور ماہرین کو دعوتِ شرکت دے۔ یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ یہ کانفرنس ذرا نئے انداز کی تھی۔ کوشش کے باوجود ڈاکٹر اِرکا مولا کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور لوگوں نے شرکت پر توجہ نہیں کی۔ اِرکا مولا ہمت نہ ہارے، مگر جب خود اُن کی اپنی حکومت (فن لینڈ) نے دستِ تعاون کھینچ لیا تو اِرکا مولا کے لیے سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ بحران میں مبتلا ہو گئے۔ بوٹ کا کرایہ (۲۵ ہزار ڈالر) ادا کر چکے تھے۔ اگر شرکا کم ہوئے تو پھر خرچ کیسے پورا ہوگا۔ کم و بیش بیس عالمی اسکالر شرکت قبول کر چکے تھے، مگر ۷۵ کے انتظام کے مقابلے میں یہ تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں لندن میں تھا۔ ڈاکٹر اِرکا مولا گھبرا کر تُرکو (فن لینڈ) سے لندن میرے پاس آ گئے۔ حواس باختہ، پریشان حال۔ میں نے اُن کے قیام کا انتظام کیا اور دوسری صبح اُن سے اطمینان سے بات کی۔ ہمدرد پاکستان زرِ مبادلہ کی وجہ سے اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اِرکا مولا کی پریشانی بھی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں اس تکلیف سے ذاتی تجربات کی وجہ سے آگاہ ہوں۔ میں لندن سے پیرس گیا۔ یونیسکو میں جا کر بات کی۔ اور پھر اللہ کا شکر ہے کہ اِرکا مولا کی تکلیف کسی نہ کسی حد تک کم ہو گئی۔ میں نے پھر برلن (جرمنی) سے تُرکو جا کر اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ سات دن تک ہم طب کے خادم جزائر فن لینڈ میں پھرتے رہے۔ رات دن پانی میں سفر کرتے رہے۔ ہم نے بالآخر ایک جائزہ رپورٹ تیار کر لی ہے۔ یہ رپورٹ اب آخری اور حتمی شکل میں ہے۔ ڈاکٹر اِرکا مولا نے آج یہ میرے حوالے کر دی ہے۔ فن لینڈ کی "یہ کانفرنس برجہازِ دُخانی" بڑا دل چسپ تجربہ تھا اور جزائر فن لینڈ میں مطالعۂ فطرت اور وہاں بسنے والوں کا اندازِ بُود و باش کا جائزہ اندازِ فکر بدلنے والا تھا! مطالعۂ حالاتِ جزائر پر شاید ہی کوئی

کتاب شائع ہوئی ہو۔ اِس کانفرنس کی رُوداد اس اعتبار سے بڑی دل چسپ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر اِر کا مولا زیربار ہو چکے ہیں اور اس اُستاد نے فن کی خاطر اپنی پونجی لٹا دی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وعدہ کیا کہ رُوداد میں طبع کراؤں گا۔ ہمدرد پاکستان اس کی مدد کرے گا۔ یہ اس موضوع پر شاید پہلی کتاب ہوگی۔ میں نے اس کی ترتیب وغیرہ میں بڑی مدد کی ہے اور میں اس سے خوش ہوں

۹ اپریل ۱۹۷۹، پیر، حلب

انسٹی ٹیوٹ اوف عربک سائنسز کے زیرِ اہتمام سمپوزیم میں میرا مقالہ "فوائد الانسان" پر ہے۔ یہ ایک مخطوطہ ہے کہ جو عین الملک حکیم دوائی نے شہنشاہِ اکبر کے ارشاد پر امراض و علاج اور افعال و خواصِ ادویہ پر لکھا ہے۔ کم و بیش تین ہزار اشعار ہیں۔ اس مخطوطے کی ایک کاپی انسٹی ٹیوٹ اوف دی ہسٹری اوف مڈیسن، تُغلق آباد، نئی دہلی (بانی ہمدرد انڈیا) میں ہے۔ میں نے اسی کا تعارف کرایا ہے۔ میں اپنا مقالہ چھاپ کر لے گیا تھا کہ وہ آج پیش اور تقسیم کر دیا گیا۔

میں نے آج ایک گھنٹہ کلیتہُ الادب میں صَرف کیا۔ یہاں ڈاکٹر مہدی محقق (ایران) نے رازی اور طبِ روحانی پر اپنا مقالہ عربی زبان میں پیش کیا۔ اس کے بعد "ہم چاروں" شعبۂ فارسی میں گئے اور وہاں جو اُستاد درسِ فارسی دے رہے ہیں وہ حلبی ہیں اور ایران میں فارسی کی تعلیم انھوں نے زیرِ نگرانی ڈاکٹر محقق پائی ہے۔ ڈاکٹر محقق اور ڈاکٹر سُہیلہ نے طلبہ سے عربی میں خطاب کیا۔ میں نے اُن سے کچھ فارسی میں اور پھر اُردو میں باتیں کیں۔ طلبہ کو اُردو سے دل چسپی تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ اُردو زبان کیا ہے اور کیسے بولی جاتی ہے! میں نے ان کو بتایا کہ یہ زبان اُردو (عساکر) مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں فارسی اور عربی کا غالب حصّہ ہے۔ چناں چہ طلبہ نے میری اُردو کو بڑی دل چسپی سے سُنا۔ یہ وقت بڑا دل چسپ گزرا۔

سیرِ حلب

آج "ہم چاروں" نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر محمد تونجی صاحب کے ساتھ، کہ اُستادِ فارسی ہیں، سیرِ حلب کی جائے۔ گزشتہ چار دنوں سے کنگرس میں شرکت کرنے کے بعد اب ہم چاروں کل واپس جا رہے ہیں اور سمپوزیم کی جانب سے سیر و سیاحت کا جو پروگرام ۱۱ اور ۱۲ اپریل کے لیے بنایا گیا ہے اس میں شرکت نہیں کر رہے ہیں، اس لیے فیصلہ کیا کہ کم از کم حلب کی تو سیر کر ہی لینا چاہیے کہ جو ایک دَور تھا کہ گہوارۂ اسلام تھا اور اس لیے گہوارۂ تہذیب اور علم و ادب تھا۔ ڈاکٹر محمد تونجی بہت مہربان ہیں، وہ بڑی خوشی کے ساتھ تیار ہو گئے۔ ان کی اپنی موٹر ہے۔ ہم چاروں اس میں سوار ہو گئے۔ "ہم چار" اس

سمپوزیم میں بڑی شہرت پا گئے ہیں۔ ڈاکٹر سہیلہ الجبوری، ڈاکٹر مہدی محقق، نوشین خانم، محقق اور میں حکیم محمد سعید۔ ہم چاروں از اوّل تا آخر ہمہ وقت اور ہمہ دم ساتھ تھے۔ جہاں بھی جاتے چاروں ساتھ ہوتے کھانا بھی ساتھ کھاتے۔ دعوتوں میں ایک ہی میز پر بیٹھا کرتے، بڑی گاڑھی چھنی۔

حلب ــــ ایک تاریخ

حلب کو عربی علوم و ثقافت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہیں عربی زبان کے عظیم شاعر المتنبی ۹۴۸ تا ۹۵۷ء تک مقیم رہے، ایک اور عظیم شاعر المعرّی (۹۷۳ تا ۱۰۵۷ء) حلب ہی کے نواح کے رہنے والے تھے۔ مشہور مسلمان جغرافیہ دان یاقوت (۱۱۷۹ تا ۱۲۲۹ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب معجم البلدان حلب ہی میں مکمل کی۔ یہیں قطبی (وفات ۱۳۶۳ء) نے ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" کے کام کو مزید آگے بڑھایا اور یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ دنیائے عرب میں پہلا عربی پریس ۱۷۰۲ء میں حلب ہی میں قائم ہُوا۔

حلب کو ترکی زبان میں "حلپ" اور مغربی زبانوں میں "ایلیپو" کہتے ہیں۔ اس کا قدیم ترین ذکر بوغز کوئی کی بعض دستاویزات میں ملتا ہے جن میں اس مقام کا نام "حلّو" یا "حلون" لکھا گیا ہے۔ بابل کے ایک کتبے میں بھی اس کا ذکر ایک عہد نامے کے سلسلے میں آیا ہے جو آشور نراری اور ماتو ایلو کے مابین ہُوا تھا۔ قدیم مصری زبان میں اسے "حرب" لکھا گیا ہے جو موجودہ نام کے قریب قریب ہے۔ مصر کے جنرل امنم حب کی سوانح حیات کے ضمن میں اس شہر کا ذکر آیا ہے جو سولھویں صدی قبلِ مسیح لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ آشوری زبان کے ایک کتبے میں حلب کے دیوتا "رمان" کا ذکر ہے۔ یہ کتبہ شمل تتار کے ایک ستون پر کندہ ہے جو ۸۵۰ قبلِ مسیح میں تیار ہوا تھا۔ ایک اور ذکر حِطیوں کے اس خاندان کے حالات میں آیا ہے جو یہاں قابض تھا۔

حلب شمالی حصۂ شام کا ایک بڑا شہر ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے عہد میں یہ مشرقِ قریب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ سطح سمندر سے ایک ہزار دو سو اُناسی فیٹ کی بلندی پر ایک ایسے نشیبی علاقے میں واقع ہے جس کے بیچوں بیچ سے ایک چھوٹی سی نہر گزرتی ہے جسے "قویق" کہتے ہیں۔ سال کے بیشتر حصے میں یہاں کی آب و ہوا زیادہ تر خشک رہتی ہے۔ بارش کی سالانہ اوسط صرف اٹھارہ انچ ہے۔ اس کے باوجود سارا علاقہ سرسبز و شاداب، خوش نما اور صحت بخش ہے۔ یہ ضلع کا صدر مقام بھی ہے۔ چوں کہ شہر کا بڑا حصّہ پہاڑی سطح مرتفع کی صورت میں ہے، اس لیے عہدِ قدیم میں یہاں کی آبادی بڑی چھدری اور پھیلے ہوئے دیہات کی صورت میں تھی اور اس لیے قدرتی طور پر بہت زیادہ نہیں تھی۔

۱۶۵۰ قبلِ مسیح میں مٹانیوں کو اس جگہ اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور پھر پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں اہلِ مصر اس جگہ چھا گئے۔ کچھ عرصے تو مصری اور مٹانی مقامی باشندوں یعنی حطیوں سے نبرد آزما رہے، لیکن انجام کار مغلوب ہو کر علاقے سے دست برداری کے لیے مجبور ہو گئے۔ بارہ سو قبلِ مسیح میں حطیوں کی سلطنت کا شیرازہ ہر جگہ بکھر گیا، لیکن انھوں نے پسپائی کے ساتھ شہر کو بھی تباہ کر دیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر معمولی قصبے کی صورت اختیار کر لی۔ نویں صدی قبلِ مسیح کے آخر میں یہ علاقہ حکومتِ یورارتو کے زیرِ نگیں ہو گیا جس کا صدر مقام مشرقی اناطولیہ میں جھیل دان کے ساحل کے ساتھ تھا، تاہم ۷۴۲ قبلِ مسیح میں تغلات پلیسر سوم کی قیادت میں آشوریوں نے حملہ کیا اور چار سال کے معرکوں میں کام یاب ہو کر اسے شمالی شام کا ایک اہم حصّہ بنا لیا۔

۵۳۹ قبلِ مسیح میں کیخسرو عظم دوم نے حلب کو فارس کی سلطنتِ اخامنشی کے ساتھ منسلک کر لیا۔ البتّہ ۳۲۳ قبلِ مسیح میں جب اسکندرِ اعظم کا انتقال ہوا تو حلب پر سیلیوکس کو اقتدار حاصل تھا، جس نے علاقے کا نام بدل کر "بیروئیا" رکھ دیا۔ پہلی صدی قبلِ مسیح میں یہ شہر شام کے رُومی صُوبے کا ایک جزو قرار پا گیا۔ بازنطینی عہد کی سب سے بڑی خصُوصیت یہ رہی کہ دوسرے مقبوضات کی طرح یہاں بھی عظیم الشان تجارتی سرگرمیاں رُونما ہوئیں۔ نیز عیسائیوں اور یہودیوں نے بہت سی یادگار عمارتیں تعمیر کیں۔ ۵۴۰ء میں ساسانی شہنشاہ خسرو اوّل اپنی مملکتِ فارس سے یلغار کر کے حملہ آور ہوا تو سارے علاقے میں تباہی پھیلا دی اور تخریبی کارروائیوں کے تحت بہت سا حصّہ نذرِ آتش بھی کر دیا گیا۔ اندازہ ہے کہ اتنی تباہی کچھ عرصہ پہلے وہاں آنے والے ایک زلزلے سے بھی نہیں ہوئی تھی۔

ظہورِ اسلام کے بعد ۶۳۷ء میں عربوں نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر یہاں قبضہ کر لیا اور آبادی کے بڑے حصّے کو مشرف بہ اسلام کر لیا۔ البتّہ دَورِ خلافت میں اس شہر نے کسی نمایاں کارکردگی کا اظہار نہیں کیا۔ دسویں صدی عیسوی کے شروع میں خاندانِ ہمدان نے حلب میں اپنے قدم جما لیے اور اسے ایک باج گزار ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ البتّہ سیف الدولہ کے عہد میں جو ۹۴۴ء سے ۹۶۲ء تک رہا، اس علاقے کو عروج حاصل ہوا، کیوں کہ وہ خود بڑا علم دوست تھا۔ اس کے دربار میں ہر وقت علما و فضلا کا اجتماع رہنے لگا تھا۔

۹۶۲ء میں ایک بار پھر بازنطینی شہنشاہ نائسی فورس دوم کے حملوں سے وہ تباہ ہو گیا اور اسے خراج بھی ادا کرنا پڑ گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے ۱۰۱۵ء میں فاطمیوں کے اور ۱۰۲۳ء میں مرداسیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ ۱۰۷۰ء میں سلجوقی فرماں روا الپ ارسلان نے یہ شہر فتح کر لیا، لیکن نو سال بعد عُقیلیوں نے اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اس اثنا میں وہ دفاعی اعتبار سے اتنا کم زور ہو گیا کہ صلیبی حملہ آوروں کی تاب نہ لا سکا۔

موقع ملتا تو اس کے باشندے سر اٹھاتے، ایک ہنگامہ برپا کر دیتے لیکن جلدی ہی پسپا ہو جاتے۔ چناں چہ بارھویں صدی عیسوی کے شروع میں وہاں کے نقشے ہر آن بدلتے رہے۔

۱۱۲۹ء میں موصل کے شہزادے عماد الدین زنگی کے سامنے یہاں کے باشندوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، تاہم اِس طرح صلیبی حملہ آوروں کے خلاف ایک محاذ قائم ہو گیا۔ سترہ سال بعد اس کے بیٹے نورالدین زنگی نے سُنّی فرقے کے افراد کی حمایت حاصل کر کے شہر کی کایا پلٹ دی۔ ۱۱۸۳ء میں حضرت صلاح الدین ایوبی نے یہ شہر فتح کیا اور وہ اُسے اپنے بیٹے الظاہر غازی کے سپرد کر کے آگے بڑھ گئے۔

جنوری ۱۲۶۰ء میں ہلاکو خاں کے زیرِ کمان منگولوں نے اس طرف رُخ کیا اور خوب تباہی مچا کر مراجعت اختیار کی۔ بہت جلد یہ شہر مصری سلطنتِ مملوک کا حصّہ بن گیا۔ اس طرح چودھویں صدی عیسوی میں بھی اِس پر ہر طرف سے یلغار ہوتی رہی اور ۱۴۰۰ء میں شاہ تیمور نے جو تباہی پھیلائی وہ سب سے زیادہ دیرپا تھی۔ پندرھویں صدی میں کچھ سکون نصیب ہُوا اور شہر نے تجارتی فروغ کے ذریعہ سے سنبھالا لیا۔

۱۵۱۶ء میں حلب سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصّہ قرار پایا، لیکن ایرانیوں سے ان حکمرانوں کی چپقلش ہوتی رہی جس کا سلسلہ اٹھارھویں صدی تک قائم رہا۔

ایک طویل مدّت کے بعد ۱۸۳۱ء میں مصری سپہ سالار ابراہیم پاشا نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، لیکن مغربی سمت سے اتنا دباؤ پڑتا رہا کہ آٹھ سال بعد ہی اسے نہ صرف حلب بلکہ سرزمینِ شام سے فرار اختیار کرنا پڑ گیا۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان عثمانی حکومت کے خلاف مظاہرے زور پکڑتے چلے گئے، جن سے زبردست جانی و مالی نقصان ہوا اور مدنی زندگی بھی برباد ہو گئی۔

۱۸۸۰ء میں ریلوے لائن پڑ جانے سے اقتصادی صورت بحال ہو گئی، لوگوں کو روزگار ملنے لگے اور ہر قسم کا کاروبار چمکنے لگا۔ صنعت کار جو بددل ہو کر کام چھوڑ بیٹھے تھے، پھر اپنے کام سے لگ گئے۔ کھیتوں اور باغوں میں بھی ہر قسم کی فصلیں پروان چڑھنے لگیں۔ اس طرح فاضل پیداوار ملکی ضرورت کے بعد باہر کے ملکوں میں فروخت ہونے لگی۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں شاہ فیصل اوّل نے اتحادیوں کی حمایت حاصل کر کے وہاں قبضہ جما لیا۔ اتحادیوں میں سے سب سے زیادہ اقتدار فرانس کو حاصل رہا۔ چناں چہ ۱۹۴۱ء تک حلب اس کے زیرِ انتداب رہا۔ اس دوران میں دوبار آزادی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی گئی، مگر پوری کامیابی نہ ہو سکی، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس دَورِ انتداب میں حلب نے صنعتی اعتبار سے ترقی حاصل کی؛ لوگوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور دانش وروں نے اسے عروج دے کر دمشق کے ہم پلّہ کر دیا۔

دُوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اور مکمل حصولِ آزادی کے بعد ترقی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عروج و زوال اور نشیب و فراز کے ان حالات سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اس قدیم شہر کو لگاتار سکون کبھی حاصل نہیں ہوا، کیوں کہ اپنے علاقے میں اسے ہمیشہ ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی اور اس لیے قرب و جوار کی ہر حکومت یا حملہ آور کی للچائی ہوئی نظریں اِس پر پڑتی رہیں۔

ان ناہموار حالات میں یادگار عمارتوں کا باقی رہنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی خلافتِ امویہ کے دَور کی ایک شان دار مسجد، جو ۷۱۵ء میں تعمیر ہوئی تھی ہنوز محفوظ ہے۔ اس کے مخروطی مینار، جو تعمیر کے اعتبار سے گیارھویں صدی عیسوی کی یادگار ہیں، بڑی دیدہ زیب ہیں۔ دینی تعلیم کے چند مدرسے بھی چشمِ عبرت کو اپنی جھلک دکھا رہے ہیں۔ اُس وقت ایک ایسی عمارت بھی تعمیر ہوئی جسے بہ یک وقت "المسجد الفضائری" اور "المدرستہ الشعیبیہ" کہا جاتا تھا۔ اس کے کچھ آثار موجود ہیں۔ آج کل اسے "الطوطی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک محل جسے عبدالملک کے بھائی سلیمان نے، جو والیِ حلب تھے، اپنے عہد میں زرِ کثیر خرچ کر کے تعمیر کرایا تھا۔ اسے "حاضر حلب" کہتے تھے۔ اب وہ "حاضر السلیمانی" کے نام سے مشہور ہے۔

شہر کے چاروں طرف کھنچی ہوئی فصیلیں جو تیرھویں صدی میں تعمیر ہوئی تھیں، بُری طرح مسمار ہو چکی ہیں، لیکن مغربی سمت میں اُن کی بنیاد اب بھی نظر آتی ہے۔ پتھروں کے انبار ثابت کرتے ہیں کہ شہر پناہ کی تعمیر میں کیسا مضبوط پتھر استعمال ہوا تھا۔ عثمانی دَور کے چند مسقف بازار ابھی برقرار ہیں۔ ان میں سے دُو عدد "خان العیون" اور "خان الوزیر" بہت مشہور ہیں۔ یورپی اثرات کے تحت جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، وہ اب بھی دیدہ زیب ہیں اور زائرین سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں۔ ان کے آثار نئی آبادیوں مثلاً العزیزیہ، الجمیلیہ، الطلال، المشارقیہ اور الجدیدہ میں نظر آتے ہیں۔

جدید حلب اب ایک بہت بڑا تجارتی شہر ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۷۰ء میں پانچ لاکھ تھی۔ اس وقت سارے ضلع کا رقبہ چھے ہزار دو سو تینتیس مربع میل ہے اور کُل آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ اس کی بڑی صنعتوں میں ریشم سازی، پارچہ بافی، کپڑے پر چھپائی، چرم سازی اور اُون کی کتائی شامل ہیں۔ اس وقت یہاں کی زرعی پیداوار میں گیہوں، باجرہ، چاول، تل، انگور، کھجور اور بعض خشک میوے شامل ہیں جو مقامی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ تجارتی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں جو قومی عجائب گھر یہاں قائم ہوا تھا، بہت سی نادر و نایاب اشیا کا حامل ہے۔ ہر چیز مفصل معلومات کے ساتھ محفوظ کی گئی ہے۔

حلب شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اور موٹر میں جگہ جگہ آثار دیکھتے ہوئے ہم پھر جامع الزکریا آئے۔ مجھے یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السّلام کا مزارِ اقدس حلب میں ہے۔ بہت بڑی مسجد

ہے۔ ہم اندر گئے۔ بڑی بہار تھی۔ ظہر کا وقت تھا۔ جماعت ہو چکی تھی، مگر لوگ آ رہے تھے اور نمازِ ظہر ادا کر رہے تھے۔ میں نے بھی دُو رکعت نمازِ ظہر قصر یہاں اطمینان سے ادا کی اور مزارِ اقدس پر حاضری دی۔ فاتحہ خوانی کی۔ یہاں اس وقت ذکر جاری تھا۔ علما ذکر میں مشغول تھے۔ بڑا اچھا اجتماع تھا۔ بڑی روح پَرور فضا تھی۔ میں ذرا دیر یہاں بیٹھا۔ اگر تنہا آتا تو شاید یہاں سے اُٹھنے کو دل نہ چاہتا۔

جامع الزکریا سے ملحق شمالی دروازے کے بالکل سامنے القدسیہ بہیلاتہ ہے۔ یہ زمانۂ قدیم میں کلیسا تھا اور اسی نام سے تھا۔ اب اس کا نام مسجدِ رُومی (المدرستہ الحکومہ) ہے۔ مسجد ویران نظر آئی۔ اس میں نماز نہیں ہوتی۔ یہ وہی مقام ہے کہ جہاں مولانا رُومی بیٹھا کرتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ یہیں سے مولانا رومی قونیہ (ترکی) گئے تھے۔ وہ مقام کہ جہاں مولانا رومی بیٹھا کرتے تھے ہنوز محفوظ ہے اور قلم دان وغیرہ بھی ہے، مگر اس مقام کی دیکھ بھال شاید نہیں ہو رہی ہے۔ بڑی ویرانی کا عالم ہے۔ ہم یہاں کافی دیر رہے۔ حلب شہر میں نئی مساجد بڑی شان دار ہیں اور بڑی خوب صورت ہیں اور مسجدوں کی دیکھ بھال کا بڑا ہی اسلا انتظام ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسجدِ زکریا اور اور مسجدِ رُومی جیسی تاریخی جگہوں کی حفاظت کا انتظام کیوں نہیں ہے؟ میں اب یہاں اس قسم کی بات کر بھی نہیں سکتا۔ یہاں کا مزاج اب بدل رہا ہے۔ عراق میں اب تک جو انقلابِ فکر آیا ہے اس کے اثرات اب شام میں محسوس ہوتے ہیں۔ بعث پارٹی زور پر آ رہی ہے، جو اشتراکیت کی ہم نوا ہے۔ اس پارٹی کا جھنڈا الگ ہے اور شام کا قومی عَلَم دُوسرا ہے، مگر یہ دونوں ساتھ ساتھ لہراتے ہیں اور ان دونوں کو قانونی اور سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو اُس کا اپنا جھنڈا تھا۔ اقتدار کے بعد پارٹی کا جھنڈا اور پاکستان کا جھنڈا دونوں ساتھ لہراتے تھے۔ یہ مماثلت قابلِ غور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں کے عوام رنگِ اسلامی میں رنگے ہوئے ہیں، دلِ مسلم عشقِ رسولؐ اور محبتِ الٰہی سے یہاں سرشار ہے۔ بایں ہمہ یہاں علما کی زبانِ سیاست بند کی جا چکی ہے۔ بعث پارٹی کی رکنیت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر کوئی طالبِ علم رکنِ بعث نہیں ہے تو شاید اس کو کالج میں داخلہ ملنے میں دشواریاں ہوتی ہیں۔ طلبہ اور طالبات کا لباس فوجی ہے۔ ان کو ہفتے میں چھ گھنٹے لازماً فوجی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے، خواہ طالبِ علم ہو یا طالبہ۔

صدرِ شام کا بیان

آج کے اخباروں میں صدرِ مملکت عالی مرتبت حافظ الاسد صاحب کا وہ پیغام شائع ہوا ہے کہ جو انھوں نے بیگم نصرت بھٹو کے نام دیا ہے۔ اس میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ پاکستان کی

دوستی کے عکاس نہیں ہیں۔ میں یہاں ہمہ وقت بڑا لیے دیے رہا اور سیاست کے موضوع پر میں نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

اس کے برعکس اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے صدرِ محترم جنرل محمد ضیاء الحق نے عرب جمہوریۂ شام کے صدر جناب حافظ الاسد کو ان کے قومی دن کے موقع پر جو ۱۷ اپریل کو منایا گیا ہے ایک پُرتپاک و پُرخلوص پیغامِ تہنیت بھیجا ہے۔

اپنے پُرجوش پیغام میں بہترین تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے صدر ضیاء الحق نے فرمایا:

"عرب جمہوریۂ شام کے اس خوش آیند یومِ سعید پر اپنی حکومت، پاکستان کے عوام اور خود اپنی طرف سے شام کے برادر عوام کو پوری گرم جوشی اور خلوص کے ساتھ ہدیۂ تبریک پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ مجھے اس حقیقت میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ پاکستان اور شام کے مابین دوستی اور تعاون کا جو رشتہ قائم ہے وہ مستقبل قریب میں مزید مستحکم اور استوار ہوگا تاکہ اس طرح دونوں قوموں کے درمیان بہترین مفادات کا مقصد پورا ہوتا رہے۔ میں اعلاحضرت کی درازیِ عمر، صحت و تن درستی اور مسرت و شادمانی کے لیے دست بدعا ہوں کہ آپ کی پُرخلوص قیادت کے زیرِ اہتمام شام کے برادر عوام ترقی و خوش حالی کی منزل میں اپنی سعی و کاوش سے عظیم الشان کامیابی کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ براہِ کرم آپ اس یقین دہانی کو ملحوظ رکھیں کہ ہم تہہ دل سے آپ کے لیے عافیت کے خواہاں ہیں۔"

قلعۃ الحلب بڑا تاریخی مقام ہے۔ آج میں نے باہر سے اس کو دیکھا۔ اندر سے دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ اس قلعے کے سامنے ایک حویلی اب تک ہے۔ یہاں ابوالہدیٰ الصّیادہ رہتے تھے کہ جو سلطان عبدالحمید کے وزیر تھے۔

اس سیر کے بعد بازارِ نباتات گیا۔ درجنوں قدیم بازاروں میں یہ بھی ایک بازار ہے۔ یہاں چند نباتات دیکھنے میں آئیں، مگر ان کا دوائی استعمال کس حد تک ہے اس کا زیادہ اندازہ نہ ہو سکا۔ دوسرے بازاروں میں ہم چاروں دو گھنٹے تک گھومتے پھرتے رہے۔ خریداری کے لیے یہاں بہت سامان ہے۔ ملکی بھی اور زیادہ تر غیر ملکی۔ دُنیا کی ہر چیز موجود ہے۔ میں تو خریداری سے ذوق رکھتا نہیں ہوں، ڈاکٹر محقق کا ذوقِ خرید فقط کتابوں تک محدود ہے اور انھوں نے دو ڈھائی سو ڈالروں کی کتابیں اب تک خریدی ہیں۔ میں نے بھی کافی کتابیں خریدی ہیں۔ تمام کتبِ طبی کی خریداری کا انتظام کر لیا ہے۔ ڈاکٹر سُہیلہ ان کو اپنے ساتھ بغداد لے جائیں گی۔ اب وہاں سے میں ان کو پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کے ذریعہ سے کسی طرح منگواؤں گا یا کوئی اور صورت پیدا کروں گا۔

دو بجے ہم فندق السیاحی واپس آئے۔ ہماری درخواست پر ڈاکٹر محمد تونجی صاحب نے کھانا ہمارے

ساتھ کھایا۔ میرے لیے ڈاکٹر سُہیلہ نے کچن میں جاکر دودھ تیار کرلیا۔ برف بھی مل گئی۔ میں نے دل بھر کر دودھ نوشِ جان کیا۔ کھانے میں علی گڑھ مسلم یُونی ورسٹی کے ڈاکٹر انصاری شریک ہوئے۔ ان سے تفصیل کے ساتھ باتوں کا موقع مل گیا۔ مَیں نے اُن سے ڈاکٹر ڈیوڈ کنگ کے بارے میں باتیں کی ہیں اُن سے میں نے کہا ہے کہ ابنِ یُونس پر جو اُن کا علمی کام ہے اس کی طباعت واشاعت میں مالی مسئلہ اگر مانع ہو تو میں اُن کی مدد اس طرح کروں گا کہ لاگت کا آدھا اُن کے پسندیدہ ناشر کو ادا کروں گا اور آدھی کتابیں ہمدرد لے لے گا اور افریشیا میں حقوقِ فروخت لے لے گا۔ یہی بات میں نے ڈاکٹر عبدالحمید صبرہ صاحب سے کہہ دی ہے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ ان دونوں سے میری طرف سے مزید یہ بات کہہ سکتے ہیں۔

طے یہ پایا تھا کہ ڈاکٹر تونجی صاحب کے ہاں چائے پی جائے گی، چناں چہ ہم چاروں ڈاکٹر تونجی صاحب کے ہاں گئے۔ ان کی اہلیہ، اُن کی بچی اور بچّے سے بھی ملاقات ہوئی۔ گھنٹہ بھر اُن کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر محمد تونجی صاحب کا مکان حلب الجدید میں ہے۔ یہ نیا حلب ہے اور یہاں پاش آبادی ہے۔ زمین بڑی گراں ہے۔ ڈاکٹر محمد تونجی کا مکان کم و بیش دس لاکھ رُپلے کا ہے۔ اب اس کی قیمت بڑھ رہی ہے۔ بڑی دل چسپ اور مقویِ قلب و رُوح بات یہ ہے کہ اس پاش آبادی میں ایک بڑا نائٹ کلب ہے۔ نام ہے: مون تانا۔ یہاں کے لوگوں نے کافی خطیر رقم خرچ کر کے اس نائٹ کلب کو خرید لیا ہے اور اسے مسجد میں تبدیل کر دیا ہے۔ نام جامع الفرقان رکھا گیا ہے۔ ایک بڑا بلند میغارہ بھی تعمیر کرا دیا گیا ہے۔ میں اس سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ ایک طرف سوشلزم لوگوں کو مذہب سے دُور کر دینے کے درپے ہے اور دوسری طرف نائٹ کلب کو مسجد بنا دینے کے واقعات، بڑی فکر انگیز بات ہے۔

حلب میں متعدد نائٹ کلب ہیں۔ بیروت کی تباہی کے بعد اب سب سے مشہور نائٹ کلب حلب ہی میں ہیں۔ یہاں عیسائی آبادی کافی ہے اور کم و بیش ۴۵ فی صد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دم سے یہ کلب آباد ہیں، مگر بقول ڈاکٹر تونجی ان کلبوں میں مے نوشی شاید مسلمان زیادہ کرتے ہیں۔ میرا دل چاہا کہ میں آج رات کسی کلب میں جاکر دیکھوں کہ صورتِ حال کیا ہے، مگر ہمت نہ ہوئی اور ہمت اس لیے بھی ٹوٹی کہ ڈاکٹر تونجی نے کہا کہ میرا یہ مقام نہیں ہے کہ مَیں اس علاقے میں قدم رکھوں۔ میں تو ہمت کر لیتا، فندق السیاحی کے پاس ہی ایک نائٹ کلب ہے، مگر میں اس کے قریب خود کیسے جاؤں!

اختتامی اجلاس

پانچ بجے ٹھیک جلسۂ اختتامیہ شروع ہوگیا۔ ڈائس پر درمیان میں ڈاکٹر احمد یوسف الحسن

صاحب تھے۔ ان کی دائیں جامعۂ حلب میں اُن کے نائب اور بائیں جانب ڈاکٹر صالح احمد العلی (عراق)۔ ہال میں مندوبین سب ہی موجود تھے۔ ابتدائی کلمات کے بعد ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب نے وہ تجاویز پیش کیں (پہلے عربی بعد میں انگریزی) کہ جو دورانِ سمپوزیم موتمرین نے دی تھیں۔ مجھے بھی فارم ملا تھا، مگر میں نے گریز کیا تھا۔ تجاویز مجموعی طور پر مفید ہیں۔

ایک مناسب تجویز یہ آئی کہ اب کہ جب بجائے ہر تیسرے سال کے ہر چوتھے سال یہ سمپوزیم منعقد ہوا کرے گا اس موقع پر عربک و اسلامی سائنس کے میدان میں ایک اہم تر علمی کام پر ایک گولڈ میڈل ممکن ہو تو نقد انعام بھی دیا جائے۔ تمام تجاویز کی طرح مجھے اِس تجویز سے بھی دل چسپی پیدا ہوئی، مگر میں نے اس پر بھی اظہارِ خیال سے گریز کیا۔ میرے دوست ڈاکٹر ڈوبس سکرٹری جنرل انٹرنیشنل یونین ہسٹری اینڈ فلاسفی اوف سائنس) نے اِس تجویز کے بارے میں معقول رویّہ اختیار کیا۔ ان کی باتیں ایسی تھیں کہ تجویز زیادہ مؤثر ہوگئی۔ میں نے یونیسکو کے پروفیسر خولودولین کو ہال میں تلاش کیا مگر وہ نظر نہ آئے۔ تجویز کی تفصیلات کے بیان میں ڈاکٹر حسن صاحب نے یونیسکو کا حوالہ دیا تھا۔ میری رائے یہ تھی کہ گولڈ میڈل اور نقد ایوارڈ یونیسکو کی جانب سے دے دیے جائیں اس سے ایوارڈ کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے اظہارِ خیال نہیں کیا۔ پروفیسر خولودولین کا مشورہ اس کے لیے ضروری تھا۔ اگر وہ ہوتے تو ایوارڈ کے بارے میں آج ہی اِس اختتامی اجلاس میں فیصلہ کرا دیتا۔ بارے اصولی طور پر تجویز منظور ہوگئی ہے کہ ایوارڈ کا انتظام ہونا چاہیے اور ہر چار سال بعد سمپوزیم کے موقع پر دیا جانا چاہیے۔ تجاویز میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ادویۂ مفردہ کی ایک مفصّل لُغت تیار کی جائے اس تجویز پر صدرِ جلسہ ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب نے کہا کہ اس میدان میں حکیم محمد سعید کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ انھوں نے میری علمی اور سائنسی خدمات کا اعتراف کیا۔

پانچ بجے سے سات بجے تک جلسہ جاری رہا اور تشکر و امتنان کے جذبات کے اظہار کے ساتھ ختم ہوگیا۔ میں نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی جانب سے اِنسٹی ٹیوٹ اوف عربک سائنس کے لیے چاندی کی ایک طشتری مناسب الفاظ کندہ کرا کے آج پیش کر دی ہے۔ میں اِس قسم کا ہدیہ تمام عالمی کانگرسوں میں دیا کرتا ہوں۔

فندق السیاحی میں واپس آکر ہم چاروں سیرِ حلب کے لیے روانہ ہوگئے۔ اب یہ سیر نئے بازاروں کی تھی۔ ان نئے بازاروں میں بھی غیر ملکی مال بھرا پڑا ہے، بلکہ یہاں تو مال ہے ہی غیر ملکی۔ میرے پاس اگر پیسے ہوتے تو میں شام کا خاص ریشمی کپڑا جیسا کہ بنارسی ہوتا ہے کچھ نہ کچھ لے ہی لیتا، کسی کو دینے کے کام آجاتا۔ ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری نے میری بیٹی سعدیہ اور اُن کی دو بیٹیوں، مسز ڈسلوا اور ڈاکٹر جبوری صاحب

کے لیے ہدایا خریدے اور اُن کو میرے حوالے کردیا۔

شام کی شان دار ترقی

اب سے تینتیس سال پہلے کی بات ہے کہ عرب جمہوریۂ شام نے اپنی سرزمین سے غیر ملکی تسلط کی آخری نشانیاں ختم کردی تھیں، لہٰذا ۱۷ اپریل کو ہر سال یوم آزادی کی تقریبات منائی جاتی ہیں۔

مورخین نے بجا طور پر ارضِ شام کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ ملک عالمی تاریخ کا پرتو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس نے عہدِ عتیق میں اپنے دریاؤں اور ساحلوں کے ساتھ ساتھ بنی نوعِ انسان کی تہذیب و شائستگی کو جنم لیتے اور اس وقت سے آج تک اس کو نشو و نما پاتے دیکھا ہے۔ شام کی تاریخ ازمنۂ قدیم سے وابستہ ہے کہ جب وحشی انسان کوہ پالمیرا کے غاروں میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے۔

تاریخ کی شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہونے کے باعث شام کی سرزمین نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ البتہ یہاں رہنے والے غریب باشندوں نے اپنی حقیقی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ اس وقت لگایا کہ جب فروغِ اسلام نے انسانی تہذیب کو نشأۃ ثانیہ سے ہم کنار کیا اور اس کا نور جزیرہ نمائے عرب سے اقصائے عالم تک پھیلتا چلا گیا۔

ملکِ شام تاریخ کے بہت سے ادوار سے گزرا ہے، خصوصاً اُس وقت کہ جب پہلی عالم گیر لڑائی کے بعد عرب مفاد کے ساتھ غداری کی گئی۔ عظیم سرزمینِ شام کو نوآبادیاتی قبضہ و استحصال کا سب سے بڑا نشانہ بنایا گیا، نفاق کا بیج بویا گیا اور اس حد تک پریشان کیا گیا کہ "دورِ انقلاب" کو شام کی تاریخ میں سیاہ ترین دور سمجھا جانے لگا۔ پھر بھی اغیار کی چیرہ دستیاں حصولِ آزادی و وقار کے ضمن میں اہلِ شام کی امنگوں کو نہ مٹا سکیں۔

۱۹۴۵ء کے بعد جب برِاعظم یورپ میں لڑائی کا خاتمہ ہوگیا تو شام کی تحریکِ آزادی نے اچانک زور پکڑا اور انجام کار نوآبادیاتی نظام و اقتدار کو سرزمینِ شام سے فرار ہو جانا پڑا۔ دشمنوں کے وجود سے دمشق کو پاک کرنے کا عمل ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔

آزادی کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن کے تحت شام دو حصوں میں تقسیم ہو سکتا تھا۔ ایک بعث پارٹی کے وجود سے پہلے اور ایک بعث پارٹی کے دوران میں۔ ۱۹۶۳ء میں بعث پارٹی کا وجود شام میں ایک نقیب کی حیثیت سے رُونما ہوا اور عوام نے بلند توقعات اس سے وابستہ کردیں۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں شام کے صدر جناب حافظ الاسد نے برسرِ اقتدار آتے ہی محتاط آزادی کا ایک

نیا دَور شروع کر دیا جس نے ایک بامقصد اقتصادی ترقی کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے عرب قوم کی خدمات کے سلسلے میں بالکل صحیح اقدامات سے کام لیا۔

اس وقت یہ اندازہ لگانا قرینِ قیاس تھا کہ اسرائیل کے ضمن میں مغربی محاذ پر سازشیں رنگ لائیں گی، لہٰذا شام اور عراق کے قائدین نے گزشتہ ماہ اکتوبر میں اپنا تاریخی اعلاسطحی اجلاس بغداد میں منعقد کیا اور مشترک قومی کارروائی کے لیے ایک منشور منضبط کر کے اس پر دستخط کر دیے۔ اس منشور کی بدولت شام اور عراق کی وہ بروقت کارروائی اپنے عروج پر پہنچ گئی جو انھوں نے مشرقی محاذ پر رکاوٹ کے لیے شروع کی تھی۔ اس طرح یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے زیادہ قریب بھی آگئے جن پر بعثِ عرب اشتراکی پارٹیوں کو اقتدارِ اعلا حاصل تھا۔ اس طرح ان کے مابین اتحاد کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔

اب تک صدر اسد کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر کامرانی یہ رہی ہے کہ انھوں نے شام کی مسلح افواج کی نئے سرے سے تنظیم کی، ان اثرات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جو جون ۱۹۶۷ء کی پسپائی نے رُونما کیے تھے اور پھر ۱۹۷۳ء کی لڑائی میں کام یابی نے عربوں کی حیثیت مستحکم کر دی اور اسرائیل کے اس دعوے کا شاید قلع قمع ہو گیا کہ اس کی طاقت ناقابلِ شکست ہے۔ اس کامرانی کا سہرا صدر اسد کے سر ہے۔

اب شام نے بڑے عزم کے ساتھ چوتھے پنج سالہ ترقیاتی منصوبے (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۰ء) پر عمل شروع کیا ہے جس پر بہ حیثیتِ مجموعی پچاس ارب شامی پونڈ صَرف ہوں گے جب کہ اس سے قبل تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اخراجات کا تخمینہ صرف بیس ارب پونڈ لگایا گیا تھا۔

اس منصوبے کے مطابق اندازہ ہے کہ پیداوار کی سالانہ شرح میں بارہ فی صد اضافہ ہوگا جس سے آخری منزل پر پہنچتے تک ملک کی قومی آمدنی دگنی ہو جائے گی۔ اس منصوبے میں بنیادی صنعتوں کے قیام اور ان کو وسیع تر کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ نیز بعض مختلف النوع کایا پلٹ صنعتوں کی مدت ختم ہونے تک شام نے تہیّہ کیا ہے کہ وہ تو فیرزر پر قابو پا کر اسے تیس فی صد سے بھی کم حد تک لے آئے گا اور جہاں تک غذائی پیداوار اور کپڑے کی صنعت کا تعلق ہے، ملک کو خود کفیل بنا دے گا۔

خصوصی منصوبے میں جو انتہائی حدیں مقرر کی گئی ہیں، ان کے مطابق اناج کی پیداوار میں ۵۸ فی صد، شکر تیار کرنے والے چقندر کی پیداوار میں کئی گنا اور انڈوں کی پیداوار میں ڈیڑھ سو فی صد اضافہ ہو جائے گا۔ سُوتی دھاگے کی تیاری چار گنی اور سیمنٹ کی کُل پیداوار ساڑھے چار سو فی صد اضافے سے پچپن لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ اسی طرح مصنوعی کھاد تین گنے اضافے کے ساتھ ساڑھے چار لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ شکر کی پیداوار دُگنی، دھات والی اشیا کی ساخت دس گنی ہو گی۔ ریفریجریٹر کی تعداد تین گنی یا کُل دو لاکھ

اور ٹیلی وژن سیٹوں کی تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

نئے بجلی گھر، جن کی مجموعی صلاحیت پیداوار چھے سو بہتر میگاواٹ ہوگی، ۱۹۸۰ء تک تعمیر ہوں گے اور ساڑھے سات سو میگاواٹ والے بجلی گھر زیرِ تعمیر ہوں گے۔ پینسٹھ فی صد آبادی کے لیے بجلی اور بیاسی فی صد کے لیے صاف پانی کی فراہمی ممکن ہو سکے گی۔ اس کے برعکس ۱۹۷۵ء میں سینتالیس فی صد کو بجلی اور پچپن فی صد کو صاف پانی ملا کرتا تھا۔

شام کے ترقیاتی منصوبوں کی تجدید

گزشتہ بیس سال کے عرصے میں عرب جمہوریہ شام کے اقتصادی حالات میں بنیادی تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ طریقِ کار نجی دائرے سے نکل کر سرکاری دائرے میں داخل ہوگیا ہے۔ اس کا آغاز زرعی اصلاحات کے اقدامات سے ہوا۔ اس وقت بڑے بڑے مقبوضات کو چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم کر دیا گیا۔ بڑی صنعتوں اور تجارتی اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ قدرتی طور پر نجی سرمایہ کاری کے کام متاثر ہوئے اور لوگوں نے بنکوں سے اپنی رقمیں تیزی سے نکالنی شروع کر دیں۔

پھر بھی اس دوران میں سرکاری طور پر رُوپیہ لگانے کی رفتار سست رہی اور منتہائے مقصود حاصل نہ ہو سکا، کیوں کہ اِسی دوران میں بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کا بار پڑ گیا تھا۔ لہٰذا سرکاری طور پر کم سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ ایک اور مصیبت کا بھی سامنا ہوا اور وہ یہ کہ کئی برس تک خشک سالی رہی اور مشرقِ وسطیٰ میں باہمی تصادم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہ سب عناصر ترقی کی رفتار پر اثر انداز ہوئے۔

۱۹۶۸ء تک مجموعی قومی پیداوار کی اوسط سالانہ رفتار ۸ء۳ فی صد سے زیادہ نہ ہو سکی، جب کہ ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کی اوسط رفتار ۱ء۳ فی صد سالانہ تھی۔ تاہم اس کے بعد کے آٹھ سال میں شام کے اقتصادی حالات میں کافی استحکام رُونما ہوا۔ حال آنکہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء میں پھر خشک سالی نے زرعی پیداوار میں رخنہ ڈال رکھا تھا۔ پھر اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل سے سخت تصادم ہُوا جس نے ہر لحاظ سے معیشت کو نقصان پہنچایا۔ اگر سیاسی ماحول کو بہتر بنانے اور حصولِ آزادی کی تدابیر اختیار کرنے کے لیے حکومت نے ۱۹۷۰ء کے بعد جو اقدامات کیے تھے، کام یاب ہو جاتے تو صورتِ حال یکسر بدل جاتی۔ اِنھی تدابیر کے تحت ایسے لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی جن کا سرمایہ ملک سے باہر لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی رقوم ملک میں واپس لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ نجی سرمایہ کاری پر جو پابندیاں عائد تھیں، وہ نرم کر دی گئیں۔ کاروبار اور ادائی کے نظام میں تیزی کے ساتھ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا گیا۔

مزید ہمت افزائی ۱۹۷۳ء کے بعد اس وقت ممکن ہوئی کہ جب شام کو بیرونی امداد بڑی تیزی کے ساتھ ملنے لگی اور تیل کی برآمد سے ہونے والی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا۔ اس طرح سرکاری سرمائے کے استحکام نے حکومت کو یہ موقع دیا کہ وہ ترقی کی رفتار اور پیداواری صلاحیت کو حسبِ منشا فروغ دے، چناں چہ ۱۹۷۶ء میں تخمینہ لگایا گیا تو پتا چلا کہ مجموعی قومی پیداوار کی سالانہ رفتار اوسطاً ۹ء۹ فی صد بڑھ گئی ہے جب کہ اسی دوران میں بڑھتی ہوئی آبادی کی رفتار صرف ۳ء۳ فی صد تھی۔ اس فروغ کا سب سے زیادہ ڈراما ئی اظہار ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۶ء کے درمیان ہوا۔ ایک سال تو ترقی کی اوسط رفتار ۱۳ فی صد سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔

تاہم ۱۹۷۶ء کے بعد شام کے اقتصادی حالات کم زور پڑنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۷ء میں مجموعی قومی پیداوار کی اوسط گھٹ کر ۶ء۲ فی صد رہ گئی۔ اگرچہ مبسوط اعداد و شمار حاصل نہیں ہو سکے، پھر بھی کئی علامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انحطاط ۱۹۷۸ء تک جاری رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۷۶ء کے آخر میں بیرونی امداد میں کچھ رخنہ پڑ گیا، جس نے مجبور کیا کہ بعض ترقیاتی منصوبوں پر کام روک دیا جائے۔ خود حکومت نے بھی اپنے سرمائے کی کچھ رقم دوسرے کاموں کے لیے واپس لے لی۔

علاوہ ازیں بارش کی کمی اور زمینوں کی بازیابی کے ضمن میں فنی دشواریوں کے باعث زرعی پیداوار گھٹ گئی۔ نسبتاً کم مقدار میں تیل نکالا گیا جس کی برآمد سے ہونے والی آمدنی میں فرق پڑ گیا۔ اسی لیے عراق کے ساتھ تیل کی فراہمی کا جو معاہدہ ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، کالعدم ہو گیا اور جب اس مد میں آمدنی نہ ہوئی تو صنعتی پیداوار کے فروغ کو نقصان پہنچا۔ اسی دوران لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو شام اس میں ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اِس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے مالیاتی وسائل دفاعی اخراجات کے دائرے میں منتقل کر دے۔ مناسب صورت یہی رہتی۔

بیرونی امداد کی وصولی جو زیادہ تر تیل برآمد کرنے والے عرب ملکوں کی طرف سے ہوئی، عطیات کی صورت میں تھی۔ ۱۹۷۳ء کے معرکے کے بعد اس ضمن میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ اس سے حکومتِ شام کی اتنی ہمت افزائی ہوتی کہ اس نے ۱۹۷۴ء میں موجودہ اور نئے اخراجات کا محاسبہ کر کے ان میں تیزی سے اضافہ کر لیا۔ کئی نئے منصوبے شروع کیے گئے۔ حکومت کی طرف سے معاشرتی خدمات میں توسیع کے ساتھ ساتھ اس نے سرکاری ڈھانچے کو بھی وسیع کر لیا۔ ۱۹۷۲ء میں مجموعی قومی پیداوار ۵ء۱۳ فی صد بڑھی تھی جو ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک اوسطاً تقریباً سولہ فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ گئی۔

عطیات دینے والے ملکوں سے سیاسی اختلافات کے پیشِ نظر ۱۹۷۶ء کے آخر اور ۱۹۷۷ء کے دوسرے نصف حصے میں بیرونی امداد کی وصولی کم کر دی گئی۔ شامی اربابِ اقتدار نے کوشش کی کہ

اخراجات کا زیر و بم برقرار رکھنے کے لیے مقامی قرضوں پر انحصار کیا جائے اور غیر ملکی زرِ مبادلہ کا محفوظ سرمایہ برابر کم کیا جاتا رہے، لیکن مسلسل بڑھتے ہوئے توازنِ ادائی میں کمی نے اخراجات کی کتر بیونت کرنے پر مجبور کر دیا۔

شام میں زرعی پیداوار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں بہت زیادہ نشیب و فراز ہوتا رہا، کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس کا بڑا دار و مدار بارش پر ہوتا ہے۔ قابلِ کاشت اراضی کے صرف چھے فی صد حصے یعنی دو کروڑ ایکڑ زمین سے صرف ساڑھے بارہ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں آب پاشی ہوتی ہے۔ بڑی فصلیں مختلف قسم کے اناجوں سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ۱۹۷۳ء کی خشک سالی نے ان کی مقدار بہت کم کر دی تھی، تاہم اس کے بعد مسلسل تین سال تک خوب بارشیں ہوئیں تو ان کی مقدار تیزی سے بڑھتی چلی گئی اور پچھلا خسارہ پورا ہو گیا۔ ۱۹۷۶ء میں پیداوار پھر گھٹ گئی، کیوں بارشیں اطمینان بخش نہ ہو سکیں۔ دوسرے یہ کہ زمین سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں سرکاری حکمتِ عملی بدل گئی۔ کوشش ہوتی رہی کہ دو اہم غذائی اشیا یعنی گیہوں اور چقندر کی پیداوار میں اُتار چڑھاؤ نہ ہونے پائے۔ شام کی سرزمین سے پیدا ہونے والا چقندر بے حد شیریں ہوتا ہے، اس لیے عرق نکال کر شکر بنانے کے کام آتا ہے۔

توقع کی گئی کہ ملک کے شمالی حصے میں دریائے فرات پر بند کی تعمیر مکمل ہونے پر شام میں زرعی پیداوار بے تحاشا بڑھ جائے گی۔ برقِ آبی اور زمین کی بازیابی کے اس بہت بڑے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف موسمی بارش پر دار و مدار کا سلسلہ کم ہو جائے اور دوسری طرف مزید سولہ لاکھ ایکڑ زمین زیرِ کاشت آ جائے، تاہم زمین کی بازیابی کی رفتار پر اُلٹا اثر پڑا جب یہ معلوم ہوا کہ اس علاقے میں کھریا مٹی کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے مصنوعی کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن آب پاشی کی نہریں اس سرزمین پر کھودی جائیں تو اُن کے کنارے کبھی سلامت نہیں رہ سکتے اور بند والی زمین میں کھار اور شور کی کیفیت رُونما ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ۱۹۷۸ء تک ایک لاکھ ایکڑ سے بھی کم زمین بازیاب ہو سکی۔

ملک میں تیل کی پیداوار جو ۱۹۶۸ء میں شروع ہوئی تھی، ۱۹۷۰ء کے اوائل تک تیزی سے ترقی کرتی رہی اور ۱۹۷۶ء میں کُل پیداوار تقریباً ایک کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء میں پٹرول برآمد کرنے والے ملکوں کے ادارے (اوپیک) نے باہمی صلاح و مشورے سے تیل کی قیمت میں جو اضافہ کیا تھا اُس نے تیل کی برآمد سے ہونے والی آمدنی پر اچھا اثر ڈالا، یعنی ۱۹۷۶ء میں تیل کی آمدنی انتہا کو پہنچ کر چھیاسٹھ کروڑ پچاس لاکھ ڈالر ہو گئی۔ یہ رقم ملک کی مجموعی برآمدی آمدنی کا ۶۲ فی صد حصہ تھی، تاہم ۱۹۷۷ء میں پیداوار اور برآمدی آمدنی گھٹ گئی۔ ایک طرف تیل پیدا کرنے والی زمین پختگی کی منزل تک آ گئی اور

دیکھ بھال کے مسائل دباؤ ڈالنے لگے اور دوسری طرف پیداوار کا بڑا حصّہ ملکی ضروریات کو پورا کرنے لگا۔

تیل کی پیداوار میں کمی نے صنعت و حرفت اور کان کنی کے شعبوں میں سُست رفتاری دکھائی، جس سے دوسری اشیا کی قیمتوں پر اثر پڑا۔ مالی دشواریاں اس اعتبار سے بھی رُونما ہوئیں کہ بیرونی امداد ایک بار پھر کم ہوگئی اور ۱۹۷۷ء میں سرکاری رقم نہ لگ سکی۔ تیل کی مد ۱۹۷۸ء میں بھی کم زور رہی، کیونکہ مذکورہ بالا اسباب بدستور قائم رہے۔

اس معاہدے کے تحت جو پڑوسی ملک عراق سے ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۵ء کے لیے ہوا تھا، عراق کا خام تیل پائپ لائنوں کے ذریعہ سے شام میں واقع برآمدی مرکز تک آتا رہا جہاں سے بحیرۂ قلزم کے ذریعہ سے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اس پر شام کو ۴۵ امریکی سینٹ فی پیپا معاوضہ ملتا رہا۔ اس کے علاوہ ۴۳ امریکی سینٹ فی پیپا مُعاوضہ اس خام تیل پر ملا جو لبنان میں طرابلس کے مرکز تک پائپ لائن تک بھیجا گیا۔

ایسا ہی ایک معاہدہ سعودی عرب کی حکومت سے بھی ہوا جس کے تحت اس کا خام تیل شام کے راستے لبنان کے برآمدی مرکز واقع زہرانی جاتا رہا۔ اس کا معاوضہ بھی حسبِ قاعدہ ملا۔ عراق سے ہونے والے معاہدے کے بموجب شام کے شہر حمص میں واقع تیل صاف کرنے والے مرکز تک عراقی خام تیل کے تیس ہزار پیپے روزانہ جاتے رہے جن کی قیمت تین ڈالر فی پیپا تھی۔

خام تیل منتقل کرنے کا مُعاوضہ جو حکومتِ شام کو ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ملتا رہا، وہ اوسطاً ۴۵ کروڑ شامی پونڈ سالانہ کے برابر تھا۔ اِس رقم سے حمل و نقل اور مواصلات کے شعبوں کو ترقی دینے میں مدد ملی، جن پر ان تین سال کی مجموعی قومی آمدنی کا گیارہ تا تیرہ فی صد حصّہ خرچ ہوگیا۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں عراق نے اپنا تیل شام بھیجنا بند کر دیا۔ اس کے برعکس سعودی عرب کو جب معلوم ہوا کہ شام نے باربرداری کے اخراجات کی شرح گھٹا دی ہے اور لبنان کی صورتِ حالات کے پیشِ نظر حفاظتی اقدامات دشوار ہوگئے ہیں تو اُس نے اپنا تیل خلیجِ فارس کے آخری مرکزوں کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۳ء میں شام کے راستے عراق اور سعودی عرب کا جتنا تیل گزرا اس کی کل مقدار تقریباً سات کروڑ تیس لاکھ ٹن (تقریباً تیرہ لاکھ پیپے روزانہ) تھی۔ ۱۹۷۶ء میں وہ گھٹ کر ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن اور ۱۹۷۷ء میں پانچ لاکھ ٹن سے بھی کم رہ گئی۔

۱۹۷۳ء کے بعد بڑے منصوبوں پر شام کے اخراجات بڑھتے رہے جس کی وجہ سے نجی سرمایہ کاری کی تجدید بھی ہوتی اور دوسرے عوامل نے بھی اپنا رنگ جمایا۔ اس طرح سب نے مل جُل کر اقتصادی حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ اِس دوران میں خلیجِ فارس کے ملکوں میں اقتصادی فروغ تیزی

سے ہوتا رہا اور بہت زیادہ انحصار درآمدی سامان پر کیا گیا، اس لیے شامی بندرگاہوں کی سہولتوں سے سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کے بچھے ہوئے جال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ اور یہ بھی ہوا کہ مزدور طبقے کے افراد اور انتظامی عملے کے اراکین خلیج کے علاقے کی طرف چلے گئے جہاں زیادہ معاوضہ ملتا تھا۔ قدرتی طور پر سرزمینِ شام پر ایسے لوگوں کی کمی ہو گئی اور سامان کی نقل و حرکت میں تاخیر ہو جانے سے شام کی مصنوعات کی مقدار گھٹ گئی، حال آنکہ صنعتی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں اس ملک نے بڑی رقمیں خرچ کی تھیں۔ بہت سے کارخانے جو پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تھے اپنی پوری استعداد کے مطابق کام کرنے سے قاصر رہے، آخر حکومت کو ترکِ وطن سے متعلق سخت قانون بنانا پڑ گیا تاکہ مزدور طبقے کے افراد باہر نہ جا سکیں۔

۱۹۷۵ء کے موسمِ خزاں میں لبنان میں لڑائی زور پکڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں وہاں کے اصل باشندے اور وہاں رہائش پذیر شامی باشندے بڑی تیزی کے ساتھ شام کے علاقے میں منتقل ہونے لگے۔ اس طرح قدرتی طور پر حکومتِ شام پر بہت بڑا مالی بار پڑ گیا، کیوں کہ اسے روٹی، شکر اور ایندھن جیسی اشیا رعایتی قیمت پر فروخت کرانی پڑیں۔ اسی دوران میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شامی فوجیں لبنان میں امن و امان بحال کرنے کے لیے استعمال کی جائیں۔ اس طرح فوجی اخراجات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ تیل برآمد کرنے والے بعض عرب ملکوں نے اخراجات کا کچھ حصہ ادا کیا، لیکن وہ کافی نہیں تھا۔

۱۹۷۳ء کے بعد شام نے جو توسیعی پالیسیاں مرتب کیں ان میں مالیانے کے نئے وسائل سے استفادہ کرنے کی تدابیر شامل تھیں۔ لہٰذا میزانیہ میں خسارے کی خلیج وسیع تر ہو گئی۔ ۱۹۷۳ء میں خسارہ تہتر کروڑ دس لاکھ شامی پونڈ کے برابر تھا جو ۱۹۷۷ء میں پانچ ارب پچاس کروڑ شامی پونڈ کے برابر ہو گیا۔ اس خسارے کا بڑا حصہ بیرونی امداد اور قرضوں سے پورا کیا گیا، لیکن ایک بڑی رقم مقامی باشندوں سے قرضے لے کر جمع کی گئی۔ حکومتِ شام کی کوشش تھی کہ عوام بچت کی عادت ڈالیں اور اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بچا کر انوسٹمنٹ سرٹیفیکیٹ خریدیں۔ اسی دوران میں توفیرِ زر کی علامات ملک میں نظر آنے لگیں۔ اس صورتِ حال کو دبانے کے لیے حکومت نے بعض بنیادی اشیا کی قیمتوں پر رعایت دے دی اور ملک میں تیار ہونے والی بہت سی چیزوں کی قیمت مقرر کر دی۔ ۱۹۷۶ء میں حالات بہت بگڑ گئے، کیوں کہ بعض مصنوعات کی پیداوار تیزی سے گھٹ گئی تھی۔ اس طرح ادائیوں کے توازن میں جو انحطاط ہوا تھا وہ زیادہ بگڑ گیا۔ تجارتی توازن کی ابتری اس لیے بھی ہوئی کہ جو چیزیں زیادہ تر برآمد کی جاتی تھیں، وہی ملک میں استعمال ہونے لگیں۔ اس کے برعکس برآمدات میں اضافے کا رجحان بڑھتا رہا۔

تاہم تازہ ترین حالات امید افزا ہیں اور توقع ہے کہ اقتصادی کیفیات سُدھر جائیں گی، کیوں کہ سیاسی اختلافات دُور ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادی مفاہمت بھی رُونما ہو چلی تھی۔ نومبر ۱۹۷۸ء میں دنیائے عرب کے بڑے ملکوں کے اعلا حکام کی جو کانفرنس بغداد میں منعقد ہوئی اس نے غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق شام کو ایک ارب اسّی کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد دینی منظور کر لی ہے۔

یہ جائزہ مجھے سرکاری و اخباری اعداد و شمار سے حاصل ہوا ہے، اور یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ شام کے بہادر عرب اس مقصد کو پالیں گے، باوجودیکہ وہاں وہی مسائل موجود ہیں اور وہی مزاج تربیت پا رہا ہے کہ جس سے اکثر و بیشتر اسلامی ممالک دوچار ہیں۔ غیر ملکی افکار کی پرورش، اپنی اقدار پر سرزنش دو ایسے بنیادی فسادات ہیں جن کا مقابلہ آسان نہیں رہا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انکارِ غیر متعدد ہیں جن کی وجہ سے ہر انسان ذہنی کش مکش کا شکار ہے اور انتشار کی سنگین گرفت میں آچکا ہے۔ شام اس فہرست سے خارج نہیں ہے اور اس کو راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے شدید جد و جہد کرنی ہو گی۔ فکر کی یک سُوئی اور عمل کی سلامتی کے بغیر عظمتوں کو چھُونا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس وقت شام میں بدیہی طور پر دو مذاہب کے درمیان رست و خیز ہے۔ دینِ اسلام یہاں کے لوگوں کے دل میں جاگزیں ہے، اور مضبُوطی کے ساتھ بیٹھا ہُوا ہے۔ دُوسرا مذہب لادینی اس کو اکھاڑ دینے کی سعی میں مصروف ہے۔ یہ وہ کش مکش ہے جس کا مظاہرہ آج افغانستان میں ہو رہا ہے اور ایران میں متوقع ہے، اور پاکستان ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال بڑی خطرناک ہے اور اس کے عواقب و نتائج عالمِ اسلام میں ضعف و نقاہت کے سوا دوسرے برآمد نہیں ہو سکتے۔

الوداعی عشائیہ

آج رات کا کھانا الوداعی تھا اور رئیس جامعۂ حلب کی جانب سے ہمارے ہی ہوٹل فُندق السیاحی میں منعقد کیا گیا تھا۔ میں نے لنچ کے وقت ڈاکٹر ایڈورڈ کنگ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہماری ٹیبل پر آجائیں۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے آگئے۔ پروفیسر ایڈورڈ کنیڈی (ماہر ریاضیاتِ عالمی)، کو بھی میں اپنے ساتھ لے آیا۔ ایران کے لطیف زادہ بھی آج ہمارے ساتھ تھے۔ کنگ کے ساتھ کوئین بھی تھیں! اُن سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ مسز کنگ نے شکایت کی کہ دورانِ سمپوزیم میں نے کئی بار آپ کو سمائل دیا، مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مَیں نے معذرت چاہی اور کہا کہ میں نے واقعی آپ کو پہچانا نہیں۔

ایک سمائل!

تفنّنِ طبع کے لیے مَیں نے ان کو "سمائل" (مسکراہٹ) دینے کے بارے میں ایک لطیفہ سُنایا۔ میں ۱۹۵۲ء میں بنکاک (تھائی لینڈ) میں تھا۔ تھائی لینڈ کا وہ دَور مفلسی کا دَور تھا کہ کرائے پر ٹیکسی تک نہیں میسّر تھی اور اب ۱۹۷۵ء میں اس شہر میں تین لاکھ سے زیادہ موٹریں ہیں کہ ان سے ٹریفک کا شدید مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ خیر ۱۹۵۲ء میں سیامی ایرویز کے دفتر گیا (سیامی ایرویز کا نیا نام اب تھائی لینڈ ایرویز ہے) دفتر میں ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کا لباس مقامی تھا اور میرے لیے وجہ دل چسپی۔ بھرپور بنا ٹھنا حُسن۔ میری نگاہیں بلا اختیار اُس خاتون پر مرتکز ہو گئیں۔ اس عالَمِ ارتکاز میں اُس قتالہ نے بڑے زور سے آنکھ ماری اور ایک براڈ "سمائل" دیا۔ میرا حال یہ کہ مَیں سر سے پَیر تک سُن ہو گیا۔ دونوں ٹانگوں میں جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ زندگی میں یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ آنکھوں کی اس زبان سے واسطہ پڑا۔ جب آنکھیں لڑتی ہیں تو دل گرفتار ہوا کرتا ہے، مگر میں تو سُن ہو گیا تھا۔ تو گویم صاحبہ، میں سمائل سے بہت ڈر گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ قاہرہ میں آبِ لیموں نمک آمیز آپ کے ہاں پی چکا ہوں، اس لیے نمک خوار بھی ہوں۔ میں نے کہا آپ دونوں میاں بیوی نے میری بات نہیں مانی۔ آپ نے اپنے بال ترشوا دیے ہیں۔ استنبول میں کنگ کو میں نے مشورہ دیا تھا کہ داڑھی وہ نہ منڈوائیں، مگر انھوں نے میری بات نہیں مانی۔ اب اِحتجاجاً میں داڑھی رکھ لوں گا۔

آج کھانے کی میز پر بڑی دل چسپ باتیں ہوئیں۔ علمی باتیں بھی ہوئیں اور لطائف و ظرائف بھی۔

ڈاکٹر حسن سے تبادلِ خیال

ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب کئی بار کہہ چکے تھے کہ وہ مجھ سے اہم باتیں کرنا چاہتے ہیں، ہم دونوں رات گیارہ بجے علاحدگی میں بیٹھ گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے تبادلِ خیال کیا۔ اس تبادلِ خیال میں انسٹی ٹیوٹ اوف عربک سائنس اور آئندہ سمپوزیم کے بارے میں باتیں کیں۔ میں نے ان سے "اسلام اینڈ سائنس" پروگرام کے بارے میں بات کی۔ ۱۵ ویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر اس موضوع پر ایک عالمی کنگرس کا انعقاد ایک لازمی ضرورت ہے۔ میں نے اِس سلسلے میں اوّلاً ایران کے ڈاکٹر سید حسین نصر صاحب سے بات کی تھی۔ اس میدان میں اُن کا تجربہ وسیع ہے۔ ان کا ذہن اس میدان میں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے کام کرتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں جب پاکستان میں کنگرس عالمی ابوریحان البیرونی ہو رہی تھی تو اُس وقت میری خواہش پر اُن کی جانب سے ایک تجویز منظور ہوئی تھی کہ پاکستان میں

ایک انسٹی ٹیوٹ اوف دی ہسٹری اوف سائنس قائم کیا جائے۔ ڈاکٹر حسین نصر کا اصرار تھا کہ "اسلامی سائنس" کا لفظ استعمال کیا جائے اور ہم نے اصولاً اس بات کو مان لیا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی تائید رُوس کے پروفیسر گونکو اسکی صاحب نے کی تھی۔ گونکو اسکی صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح اُن کو میں پاکستان کا دوست بنا دُوں۔ ڈاکٹر نصر اب ایران میں نہیں ہیں اور اُن کے ایران واپس آجانے کے امکانات روشن نہیں ہیں۔ اب ہم اُن کے تجربات سے اور ایران میں اُن کے اثرات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے ۱۵ ویں صدی کے آغاز کے موقع پر اسلام اور سائنس کے موضوع پر ایران میں عالمی کنگرس اور نمائش ہوگی یا نہیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وزرائے خارجہ ممالکِ اسلامیہ کی قراردادِ رباط کے مطابق یہ موضوع ایران کو دیا جاچکا ہے۔ انقلابِ ایران کے بعد شاید اس فیصلے پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر مہدی محقق صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ اُن کی رائے ہے کہ وزیرِ اعظم ایران کو اسلامی سکرٹری ایٹ کی جانب سے توجہ دلائی جائے۔ میں نے ان کا مشورہ نوٹ کر لیا ہے۔ میں نے جائزہ لیا کہ اگر ایران میں یہ کام نہ ہوسکے تو کیا حلب میں یہ کام ہوسکتا ہے؟ میں نے ڈاکٹر حسن سے بات کی ہے۔ وہ اپنے تیسرے سمپوزیم کا موضوع اس کو نہیں بنا سکتے، اس لیے اس میں وہ غیر مسلم اسکالرز کو دعوت دینے کے پابند ہیں جب کہ ۱۵ ویں صدی کی تقریبات میں غیر مسلموں کو دعوتِ شرکت نہ دینے کا فیصلہ ہوچکا ہے اور زیادہ صحیح نہیں ہے، مگر وہ اس کے لیے آج تیار ہوگئے ہیں کہ اگر مالیات کا مسئلہ حل کر دیا جائے اور کافی فنڈس دے دیے جائیں تو دُو سال بعد وہ ایک عالمی کنگرس کا انتظام کرسکتے ہیں اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کو تیار ہیں۔

اب میں انشاء اللہ تعالےٰ جدہ جاکر اس بات میں حتمی مشورہ دُوں گا اور مناسب اقدامات کی رائے دُوں گا۔

ترجمۂ انگریزی القانون فی الطب

ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب سے میں نے ترجمہ انگریزی قانون شیخ الرئیس کے بارے میں مشکلات کا ذکر کیا اور اُن سے مشورہ کیا کہ اس کام کو کس طرح سرانجام دیا جائے۔ وہ اس مسئلے سے آگاہ تھے اور آج اس پر گفت گو کے لیے تیار۔ اُن کے مشورے سے ڈاکٹر غادہ کرمی صاحبہ اور ڈاکٹر نشأت حمارنہ صاحب کو شریکِ گفت گو کرلیا گیا اور طے یہ پایا کہ ڈاکٹر غادہ کرمی کو اس کام کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار کرلینا چاہیے۔ ڈاکٹر حسن صاحب سے بات ختم ہوگئی۔ میں نے اُن کو اور انھوں نے مجھ کو خدا حافظ کہا۔ اُن کی جانب سے ہدایا بھی مجھے مل گئے ہیں۔ میں نے اُن کا دلی شکریہ ادا کیا۔

محترمہ ڈاکٹر غادہ کرمی

رات ایک بجے تک ڈاکٹر غادہ کرمی صاحبہ سے اور ڈاکٹر حمارنہ صاحب سے تبادلِ خیال کرتا رہا۔ افسوس یہ رہا کہ قاہرہ سے قانونِ شیخ سے متعلق کاغذات نہیں آسکے۔ سفارتِ پاکستان نے حلب بہ ذریعہ تار مجھے مطلع کیا ہے کہ ان کاغذات کو بہ حفاظت حلب پہنچانا ممکن نہیں ہو سکا ہے بارے ڈاکٹر کرمی سے بات کرلی ہے۔ وہ میرے ساتھ پلاؤڈف (بلغاریہ) میں رہی ہیں اور حمارنہ بھی۔ اب وہ جامعہ حلب کو چھوڑ کر لندن یا امریکا جانا چاہتی ہیں۔ میں نے تو اُن کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر حسن صاحب کے ساتھ کام کریں۔ ڈاکٹر غادہ کرمی میں کئی خصوصیات جمع ہیں: وہ طب کی ڈاکٹر ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ انگریزی خوب جانتی ہیں۔ عرب ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، وہ القانون فی الطب کا انگریزی ترجمہ کرنے کی پوری طرح اہل ہیں۔ میں نے اُن سے معاملات خاصی حد تک طے کرلیے ہیں اور ان کو آمادہ کرلیا ہے کہ وہ برطانیہ وغیرہ جانے کے بجائے دہلی جاکر رہیں۔

رات ہی کو میں نے دس صفحات کا ایک نوٹ دہلی کے لیے بنام برادر محترم جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب تیار کردیا ہے۔ تین بج گئے۔ میں نے نمازِ تہجد ادا کی۔ پھر نمازِ فجر ادا کرکے لیٹ گیا۔ شاید مجھے نیند آجائے۔ نہ آئے تو نہ آئے!

ڈاکٹر ہاشمی

جامعہ حلب کے ایک پرانے اُستاد ڈاکٹر یحیٰی ہاشمی صاحب ہیں۔ ان کے اکثر خطوط کراچی میں ملتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ مجھے "مائی ڈیر انٹرنیشنل اسکالر" لکھتے رہے ہیں۔ ایک سیشن میں اُن کا مقالہ تھا، مگر وہ موجود نہیں تھے۔ میں نے پروفیسر عُنتابی صاحب سے معلوم کیا۔ پتا چلا کہ وہ علیل ہیں اور اب وہ چل پھر نہیں سکتے ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ کیانی صاحب ماہر امراضِ جلد نے کرم فرمایا۔ عنتابی اور کیانی صاحب جلسہ اختتامی کے بعد مجھے اپنے ساتھ ڈاکٹر یحیٰی ہاشمی صاحب کے گھر لے گئے۔ وہ معذور ہیں۔ رعشہ شدید ہے۔ توازن برقرار نہیں ہے۔ تاہم وہ ملاقات کے لیے تیار تھے۔ اُن کے صاحب زادوں نے اُن کو سُوٹ وغیرہ پہنادیا تھا۔ میں پہنچا تو وہ خود استقبال کے لیے دروازے پر موجود تھے۔ دو گھنٹے میں اُن کے پاس رہا۔ ثقلِ سماعت بھی ہے، بہ مشکل سُنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مجھ سے مل کر بڑے ہی خوش ہوئے۔ میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تیر گئے۔ اُن کے صاحب زادے صاحب نے کہا کہ آپ سے ملنے کو بے چین تھے۔ ورنہ عرصہ دراز سے بالکل خاموش رہتے ہیں۔ مَیں نے روانہ ہوتے

وقت عرب انداز سے اُن کو پیار کیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل کر اصرار کر کے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے۔ اِن سے مل کر خود مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ جب میں نے ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب سے ذکر کیا تو وہ بڑے خوش ہوئے! آپ نے بڑا اچھا کیا کہ اس عظیم انسان سے مل آئے!

۱۰ اپریل ۱۹۷۹ء، حلب۔ دمشق۔ جدّہ

تبصرۂ بی بی سی

مجھے بی بی سی سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حکومتِ شام نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدرِ محترم جنرل ضیاء الحق سے کہا ہے کہ وہ اپنا دورۂ شام غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کر دیں۔ اسلام آباد کے باخبر حلقوں نے اس خبر کو انتہائی غلط اور گمراہ کن قرار دیا ہے۔

ان ذریعوں کا کہنا ہے کہ یہ خبر کہ مذکورہ بالا دورہ ماہ اپریل کے آخر تک عمل میں آنے والا تھا، قطعی بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دورے کے لیے کوئی تاریخ سرے سے تجویز ہی نہیں کی گئی تھی۔ اصولی طور پر دونوں ملکوں میں سے کسی کی بھی طرف سے اس کی منظوری نہیں دی گئی تھی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ صدرِ پاکستان نے نومبر ۱۹۷۷ء میں کویت، متحدہ عرب امارات، لیبیا اور اردن کا دورہ کیا تھا۔ پاکستان کے دفترِ خارجہ نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس علاقے کے دو اور ملکوں کا دورہ باقی رہ گیا ہے جو اب ہو جانا چاہیے، لیکن یہ خیال محض تحقیقات اور استفسار کی منزل تک رہا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ بات چیت یا تحقیقاتی روابط جو سفارتی سطح پر قائم ہوتے ہیں، ہر سال دفترِ خارجہ کے معمولات میں شامل ہیں اور اُن کے مطابق عمل ہوتا آیا ہے۔

پاکستان میں عام تاثر یہ ہے کہ بی بی سی کی یہ خبر نہ صرف گمراہ کن اور معاندانہ ہے بلکہ پاکستان میں افراتفری پھیلانے کے سلسلے میں اس کی یہ ناکام کوشش اور بدنیتی پر مبنی کارگزاری اِنتہائی افسوس ناک بھی ہے۔ کم و بیش ایک سال سے نشریات کا یہ برطانوی ادارہ یہ تاثر پھیلانے میں مصروف ہے کہ بھٹو کے بعد یہ ملک ختم ہو جانے کے قریب ہے اور سیاسی افق پر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ وہ اپنے غلط انداز منصوبوں میں بُری طرح مایوس ہو جانے کے بعد اپنی پست ذہنیت کا مظاہرہ کرنے کی ذلیل سطح پر اُتر آیا ہے۔ کیا اس کے نزدیک آزادیِ صحافت کا صرف یہی مقصد ہے؟

میں نے اسلام آباد کے ذرائع اطلاعات کے اس بیان کو بڑی دل چسپی کے ساتھ پڑھا ہے لیکن

میں اپنی جگہ ہمیشہ حیران ہوتا ہوں اور آج بھی حیران ہوں کہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ اور اخبارات بی بی سی کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اخبارات میں بی بی سی کے حوالے دیتے ہیں، حتیٰ کہ ریڈیو پاکستان تک اس سے خالی نہیں ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ بی بی سی شرارت پر آمادہ ہے اور اس ریڈیو اور ٹیلی وژن نے پاکستان کو ہمیشہ شدید ترین نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی شرارت اور غیر ذمّہ داریاں ہم جانتے ہیں، ہم اس کی اسلام دشمنی سے آگاہ ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہمارے ذرائع ابلاغ کے لیے موقّر ہے۔ میری رائے میں یہ فکر کا فساد ہے اور صحافت کی ناتوانی ہے۔ بہتر ہے کہ پاکستان اس صورتِ حال کی اصلاح کا سامان کرے اور بی بی سی کو نظر انداز کر دینے کی رَوِش اختیار کرے۔

صبح ساڑھے سات بجے پنجابی یونی ورسٹی (پٹیالہ، انڈیا) کے پروفیسر شرما ملاقات کے لیے آ گئے۔ میں تیار ہو کر اس وقت میز پر بیٹھ چکا تھا۔ ان سے باتیں کیں۔ سمپوزیم میں مَیں نے ان کو دعوتِ شرکت بھجوائی تھی اور اُن کے لیے مناسب سہولتیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ ڈاکٹر شرما اسی طرح ہیں جیسے کہ ہمارے ملک میں تمام پروفیسر ہوا کرتے ہیں۔ ان کا میدان ایسٹرانومی ہے۔ وہ اس موضوع پر ہندو اور ویدک نقطۂ نظر سے بڑی اہم تقریریں کر سکتے ہیں۔ اس میدان میں ان کا علم اچھا ہے۔ میں ان کو پسند کرتا ہوں اور ان کی خاطر کو دل چاہتا ہے۔ اُن کا ذوق و شوق ان کو ترکو (فن لینڈ) بھی لے گیا تھا۔ وہاں بھی میں اُن سے تعاون کے لیے موجود تھا۔

۸ بجے ڈاکٹر انصاری (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی انڈیا) کا ٹیلی فون آیا کہ وہ اب روانہ ہو رہے ہیں۔ میں تیار ہو کر فوراً نیچے آ گیا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ اس وقت بس سارے ہی مندوبین روانہ ہو رہے ہیں۔ کوئی کسی ٹور پر جا رہا ہے اور کوئی کسی سیر کو نکل رہا ہے۔ عملاً کل رات کانگرس اختتام پذیر ہوئی اور اب آج مندوبین ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، جُدا ہو رہے ہیں۔ کانگرسوں میں یہ وقت بڑا تکلیف کا ہوتا ہے۔ گو مندوبین چند ہی دن ساتھ رہتے ہیں، مگر اُن چند ہی دنوں میں بڑی اپنائیت پیدا ہو جاتی ہے اور جُدائی شاق گزرتی ہے۔ اپنائیت اور یگانگتِ باہمی سچے اہلِ علم میں جس قدر جلد پیدا ہوتی ہے اور دَوام اختیار کرتی ہے ایسا کسی اور میدان میں نہیں ہوتا۔ یہ علم ہی ہے کہ جو دِلوں کو ایسا جوڑتا ہے کہ جُدائی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ میں نے سب ہی سے ملاقاتیں کر کے ایک ایک کو خُدا حافظ کہا۔ روسی وفد الگ جا رہا ہے۔ اس میں پروفیسر خولو دولین بھی ہیں۔ میں تو ان کی تلاش میں تھا۔ میں نے اُن کو علاحدہ لے جا کر اُن سے اطمینان کے ساتھ تبادلِ خیال کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ عربک اسلامک سائنس میں اہم اور نمایاں کام کرنے والے کو گولڈن میڈل اور کیش ہمدرد ایوارڈ کے طور پر دیا جانا مناسب ہو گا۔ اور یہ اب یونیسکو کی جانب سے ہونا چاہیے۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن،

پاکستان پانچ ہزار ڈالر کیش پرائز ہر چوتھے سال بذریعۂ یونیسکو دے گا۔ پروفیسر خولو دولین نے اس تجویز کو توقع کے مطابق سراہا اور وہ اس سے خوش ہوئے۔ اہلِ علم ہیں اور صاحبِ ذوق ہیں۔ ان سے یہی توقع تھی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ جناب ڈائریکٹر جنرل یونیسکو کو جلد از جلد تجویز بھجوا دینی مناسب ہوگی، کیوں کہ اس سال مئی میں اس قسم کے معاملات پر غور اور فیصلہ ہونا ہے۔

ڈاکٹر غادہ کرمی اور ڈاکٹر نشاط حمارنہ بھی پھر ملنے آئے تھے۔ غادہ کرمی نے کہا کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ترجمۂ قانونِ ابنِ سینا کا کام مَیں لندن میں بیٹھ کر کروں کہ جہاں کیمبرج اور اوکسفرڈ ہے اور جہاں ہمہ قسم کی علمی امداد ہر جگہ سے زیادہ مل سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا فیصلہ ہمدرد انڈیا کو کرنا ہے، تاہم میری معلومات یہ ہے کہ ہمدرد انڈیا یہ کام دہلی میں بٹھا کر کرانا چاہتا ہے۔ اس لیے پہلے ڈاکٹر غادہ کرمی کو دہلی بہر حال جانا چاہیے۔

ہم "چاروں" نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ میں تو بس کوئی جُوس ہی پیتا ہوں، مگر مَیں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ ناشتے میں شرکت نہ کی ہو۔ ناشتے سے فارغ ہو کر محترمہ نوشیں خانم اور محترمہ ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری سیرِ بازار کے لیے چلی گئیں۔ میں نے ڈاکٹر مہدی محقق سے کہا کہ ہو نہ ہو یہ دونوں صرافہ جائیں گی اور چاندی کے سامان میں سے خریداری کریں گی۔ یہاں چاندی کا سامان بڑی شہرت رکھتا ہے۔ میں نے بھی کل دیکھا تھا۔ دل للچایا تھا، مگر میں نے خریداری سے گریز کیا۔ چاندی کی ۳۳ دانوں کی ایک تسبیح پر نظر جم کر رہ گئی مگر اس کی قیمت زیادہ تھی۔ آج صبح ہی بذریعۂ ڈاکٹر سُہیلہ مجھے میری اہلیہ کے لیے چاندی کا دست بند ہدیتہً ڈاکٹر احمد یوسف الحسن صاحب کی جانب سے مل گیا ہے۔ یہ کافی ہے۔ میری اہلیہ زیور نہیں پہنا کرتیں۔ ان کے پاس جو زیور تھا وہ میں نے فروخت کر کے ۱۹۴۸ء میں کاروبارِ ہمدرد میں لگا دیا تھا۔ اس زیور سے پاکستان میں نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ گھر کا خرچ بھی چلا تھا۔ یہ سب قوم کے نام وقف ہو گیا۔ میری اہلیہ تبلیغ و خدمت میں لگ گئیں۔ ان کو زیور کپڑے سے کوئی محبت نہیں رہی۔ وہ موٹا جھوٹا پہنتی ہیں اور اس میں خوش ہیں اور اللہ تعالٰے کا شکر ادا کرتی ہیں۔

ساڑھے دس بجے ہم چاروں کا قافلہ ہوائی میدان روانہ ہو گیا۔ نہایت اعلا انتظام تھا۔ کارکنان سمپوزیم ہمہ دم خدمت و مدد کے لیے آمادہ و تیار تھے۔ توقع کے مطابق ہوائی جہاز دیر سے آیا اور دیر سے اُڑا۔ میرے ہم سفر ڈاکٹر لوئی دلو بھی ہیں۔ یہ انٹرنیشنل سوسائٹی اوف دی ہسٹری اوف میڈیسن کے سکرٹری جنرل ہیں۔ صرف فرانسیسی زبان جانتے ہیں۔ ان سے بارہا ملاقات ہوئی ہے۔ بلغاریہ (پلاؤڈِف) میں بھی ساتھ تھے۔ وہاں اُن کے ایما پر میں نے انٹرنیشنل سوسائٹی کی رکنیت قبول کی تھی۔ آج بھی میں نے گائڈ کی مدد سے ہوائی میدان پر ان سے اگلی میٹنگ کے بارے میں تبادلِ خیال

کیا تھا کہ جو اب بارسیلونا میں ہوتی ہے۔ اس میں شعبۂ طب کے بارے میں ان کو مناسب مشورے دے دیے ہیں۔ مگر طے یہ پایا ہے کہ میں ان کو جلد ایک مبسوط لائحۂ عمل تیار کر کے بھجوا دوں گا۔ بارسیلونا کی میٹنگ کو اس بار طب کے لیے زیادہ مؤثر بنانا ہے۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ دنیائے عرب سے کم از کم ۱۵-۱۶ اسکالرز کو طب کے شعبے میں مؤثر تحقیقی کام کرنے کے لیے ہموار کروں گا اور یہ ایک مؤثر گروپ وہاں شریک ہوگا۔ اسی قسم کی کارروائی مجھے انٹرنیشنل یونین اوف ہسٹری اینڈ فلاسفی اوف سائنس کی عالمی مجلس کے لیے کرنی ہے کہ جو رومانیہ میں اگلے سال منعقد ہوگی۔ سکریٹری جنرل ڈاکٹر فوربس (ایڈنبرا) سے بات کرنی ہے۔ میں نے اُن کو طب کے بارے میں باتیں بتادی ہیں۔ ان کی جانب سے مجھے یہ پیش کش ہے کہ اس میدان میں کوئی تحقیقی کام کرنا چاہے تو وہ ایڈنبرا یونی ورسٹی میں اس کے لیے سہولتیں فراہم کردیں گے۔ یاد آتا ہے کہ میں نے جامعۂ کراچی کے وائس چانسلر صاحب کو اس پیش کش سے آگاہ کردیا تھا۔ بارے عالمی اجتماع کے لیے شعبۂ طب کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے مجھے خاکہ تیار کرنا ہے۔

پچاس منٹ پرواز کے بعد السوریہ (سیرین عرب ایر لائنز) کا جہاز جامنیں گھلا کر دمشق کے ہوائی میدان پر ڈیڑھ بجے کے قریب اترا۔ محترمہ نوشین محقق کا حال بگڑ گیا۔ شاید کئی لوگوں کو قے بھی ہوگئی ہے، کیوں کہ قے کرنے کی تھیلیاں فراہم کی جارہی تھیں۔ موسم تو خراب نہ تھا۔ شاید کپتان صاحب جولی موڈ میں تھے!

اب ہم چاروں کی جدائی کا وقت بھی آگیا۔ میرا جہاز السعودیہ تین بجے جدہ روانہ ہوگا۔ جہاز آبھی گیا ہے۔ دمشق کے ہوائی میدان پر سمپوزیم کی جانب سے استقبال و انتظام قابلِ اطمینان تھا۔ سامان وغیرہ حاصل کر کے السعودیہ میں میری بکنگ کرادی گئی۔ کسٹم کے مراحل منٹوں میں طے کر لیے گئے اور میں انتظار گاہ میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر سُہیلہ الجبوری آخر تک ساتھ رہیں۔ اب میں نے ان سب کو خدا حافظ کہا اور انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک میں گزشتہ چند دنوں کی علمی مصروفیتوں اور ہم چاروں کے کردار پر غور کرتا رہا۔ ہم نے اس سمپوزیم میں خاصا مؤثر کردار ادا کیا ہے اور قدیم روابط کو تازہ اور نئے روابط پیدا کرنے کے لیے تگ و دو کی ہے۔ اب باقی تینوں دو دن دمشق میں رہیں گے، شاید ڈاکٹر سُہیلہ چار دن۔ میں نے ان کو طبی کتب کے بارے میں پوری بات سمجھا دی ہے کہ دمشق سے جس قدر کتبِ طبی مل سکیں اور جس زبان میں ہوں سب خرید کر اپنے ساتھ بغداد لے جائیں۔ میں بغداد سے کسی نہ کسی طرح ان کو کراچی منگوا لوں گا، لیکن کوشش یہ کریں کہ دمشق کا کوئی بڑا بک سیلر پرفارما انوائس دے دے اور میں ایل سی کھول کر کتابیں بذریعہ بینک منگوالوں۔ جو بھی ممکن ہو کرلیں۔ کتابیں بہرحال درکار ہیں۔

السعودیہ کا ہوائی جہاز بڑا صاف ستھرا، دُھلا چمکا کھڑا ہے۔ میں جا کر سوار ہو گیا۔ جہاز وقتِ مقررہ پر ٹھیک تین بجے روانہ ہو گیا اور دو گھنٹے میں اس نے جدّہ کے ہوائی میدان پر جا کر اُتار دیا۔ یہاں ملکِ شام کے مقابلے میں وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ میں نے اپنی گھڑی میں پانچ کے بجائے چھے بجا لیے۔ راستے کے دو گھنٹے میں نے پوری طرح استعمال کیے۔ اسلامی سکرٹری ایٹ سے متعلق تمام فائل صبح ہی میں نے اپنے ہینڈ بیگ میں منتقل کر دیے تھے۔ میں دو گھنٹے تک ان فائلوں کا مطالعہ کرتا رہا اور کل سے جو مشاورتی کام ہونا ہے اس کے لیے نوٹ تیار کر لیے۔

جدّہ سے ہوائی میدان پر اسلامی سکرٹری ایٹ کی جانب سے استقبال کا انتظام تھا۔ سارے مراحل منٹوں میں طے ہوئے۔ سامان بھی بس پانچ چھے منٹ میں مل گیا۔ میں باہر آیا تو پیارے دوست کوڈور محمد آصف علوی اور ان کی بیگم محترمہ سعیدہ علوی موجود تھے۔ ان دونوں سے مل کر دل خوش ہو گیا اور ساری تھکن اتر گئی۔ میرے لیے سکرٹری ایٹ سے "ہیئتِ سیاسیہ" کی پلیٹ کے ساتھ موٹر موجود تھی۔ میں علوی صاحب سے رخصت ہوا۔ طے یہ پایا کہ رات کا کھانا میں ان دونوں کے ساتھ کھاؤں گا۔

نو بجے فندق الریاض آکر علوی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ہم پہنچے تو جناب محترم ڈاکٹر حامد بلگرامی صاحب منتظر تھے۔ ان کو محترمی جناب ظفر الاسلام صاحب (اسسٹنٹ سکرٹری جنرل اسلامی سکرٹری ایٹ) نے میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہوائی میدان پر اترتے ہی میں نے علوی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ جمعہ کو عمرہ کریں گے۔ ذرا ڈاکٹر بلگرامی صاحب کو اطلاع دے دیجیے گا۔ ان کو ساتھ لیں گے اور اب آج ہی اُن سے ملاقات ہو گئی۔

ڈاکٹر حامد بلگرامی عالم ہیں، اسکالر ہیں، اللہ والے ہیں، انسان ہیں۔ ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ شاید سنہ ۱۹۵۵ء میں ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دوست جناب ادریس احمد مینائی صاحب ان کو لائے تھے۔ بس اس پہلی ملاقات میں میرا دل اُن کے دل سے مل گیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر بلگرامی جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے وائس چانسلر بنے۔ میں وہاں بھی گیا تھا اور حسبِ وعدہ اساتذہ سے خطاب کیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب حیدر آباد پبلک اسکول کے سربراہ بنے۔ مَیں وہاں بھی اُن سے ملنے گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر فضلُ الرحمٰن صاحب الانصاری کے اسلامی سنٹر سے رخصت ہو کر مستقلاً جدّہ تشریف لے آئے ہیں۔ اور یہاں علمی خدمات میں مصروف ہیں۔

آج رات ساڑھے گیارہ بجے تک ان سے تبادلِ خیال ہوا۔ بہت دل چسپ صحبت رہی۔ علوی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ مجھے فندق الریاض آکر چھوڑ گئے۔ علوی صاحب سے ۱۹۵۳ء سے یاد اللہ شروع ہوئی۔ میں ان دونوں میاں بیوی کا مُعالج تھا اور پھر ان دونوں کا بھائی بن گیا۔ ہم دونوں میں اب تک

یہ اختلاف باقی ہے کہ محترمہ سعیدہ علوی میری بہن ہیں یا بھابی ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ علوی صاحب شکست کھاکر بہنوئی بن گئے ہیں۔ دونوں میاں بیوی باغ و بہار ہیں۔ علوی صاحب جہاں بیٹھ جائیں محفل خنداں ہو جائے۔ دونوں دین دار، اللہ کے بندے اور عاشقِ رسولؐ۔ میں نے گزشتہ ۲۶، ۲۷ سال میں ان دونوں کو جتنا قانع اور جتنا خوش دیکھا ہے میں ان پر رشک کرتا ہوں اور ان کی دین داری اور پرہیزگاری کا معترف ہوں۔ اس قدر طویل عرصے میں صرف ایک بار میں نے کموڈور محمد آصف علوی کو پریشان دیکھا ہے۔ وہ دن وہ تھا کہ جب پاکستان نیوی کے کمانڈر ان چیف کا فیصلہ ہونا تھا۔ میں اُس دن ان دونوں کے ساتھ تھا اور مصروفِ دُعا کہ فیصلہ حق ہو اور حق دار کو حق مل جائے۔ مگر علوی محروم کر دیے گئے اور پاکستان نیوی کے کمانڈر ان چیف جناب اے۔ آر۔ خان صاحب بنا دیے گئے جو علوی صاحب سے ہر حال میں جونیر تھے۔ یہ فیصلہ بہر حال غلط تھا اور ناحق۔ علوی صاحب کو بھی یہی دُکھ تھا کہ انصاف نہ ہوا مگر میں نے دیکھا کہ دوسرے دن وہ بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ان کو یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی اور وہ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ پر معاملہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جن صلاحیتوں کے وہ مالک ہیں اور اسلام کے وہ جس انداز کے سپاہی ہیں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔ اِس جیسے انسان کو پاکستان کی خدمت کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے کہ وہ ان دنوں جدّہ میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں، جو یقیناً ان کے مطابقِ مزاج نہیں، مگر ساری زندگی دیانت و امانت کے ساتھ گزارنے والا شکم پُری کے لیے اب یہ کر رہا ہے۔

۱۱ر اپریل ۱۹۷۹ء، بدھ، جدّہ سعودی عرب

اسلامی سکرٹری ایٹ یعنی الامانۃ العامۃ لمنظمۃ المؤتمر الاسلامی (GENERAL SECRETARIATE OF THE ORGANIZATION OF THE ISLAMIC CONFERENCE) میں پروگرام کے مطابق سوا نو بجے صبح پہنچ گیا جہاں جناب حسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جنابِ حسن اسلامی سکرٹری ایٹ میں خصوصیت کے ساتھ ۱۵ ویں صدی ہجری کے سلسلے میں ذمّہ دار ہیں۔ جناب محترم ظفر الاسلام صاحب (اسسٹنٹ سکرٹری جنرل) سے کل میں نے بات کر لی تھی۔ ان سے تبادلِ خیال سے قبل جناب حسن صاحب سے ابتدائی باتیں کرنی مناسب تھیں۔ میں اُن کے دفتر میں بیٹھ گیا اور کاموں کا جائزہ لیتا رہا تا آں کہ جناب محترم ظفر الاسلام صاحب سے ساڑھے دس بجے میٹنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس میٹنگ میں ڈاکٹر غریب ایم۔ جمال بھی شریک ہوئے۔ وہ اس پروجیکٹ سے متعلق ہیں۔ میں نے کل جو نوٹ (نکاتِ تبادلِ خیال) تیار کیے تھے وہ اُردو میں تھے۔ اس علاقے میں

بجلی کا نظام بگڑا ہوا ہے اس لیے فوٹو کاپی کا انتظام نہیں ہے۔ بالآخر میں نے اسٹینو کو انگریزی میں سب نکات ڈکٹیٹ کر دیے اور انھوں نے آدھ گھنٹے میں تین صفحات ٹائپ کر کے لا کر دے دیے۔ اس کام میں سہولت پیدا ہوگئی اور مختلف موضوعات پر ابتدائی تبادلِ خیال ہوگیا ہے۔ اس کام میں کافی وقت لگ گیا اور تقریباً ۲ بجے یہ کام ہوا۔ آج ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ کل جب بیٹھیں گے تو فیصلہ کر لینے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ تمام معاملات پر ہر پہلو سے غور کر لیا گیا ہے۔ تبادلِ خیال میں انتہائی احتیاط برتی گئی ہے۔ معاملات پر انتہائی گہرائی میں جا کر حالات اور ضروریات کو سمجھا گیا ہے اور اب مزید غور و فکر کے لیے بات کو یہیں چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ کل اطمینان سے صحیح رُخ پر صحیح قدم اٹھایا جا سکے۔

میں تین بجے فندق الریاض آ گیا۔ ایک گھنٹہ کامل آرام کے بعد میں تیار ہو کر میز پر بیٹھ گیا اور آج صبح جن مسائل پر غور و فکر ہوا ہے ان پر میں نے ازسرِ نو غور کیا۔ میرے ساتھ دو درجن فائل ہیں۔ میں نے ان فائلوں کو بہ غور دیکھا۔ مسائل کا مطالعہ کیا۔ رات کے سوا آٹھ بجے تک میں مصروف رہا اور بڑی یک سُوئی کے ساتھ۔ عالمی مسائل ہیں اور ان پر عالمی روشنی میں غور و فکر کرنا ہے اور عالمی انداز کے فیصلے کرنے ہیں۔

اسلامی سکریٹری ایٹ میں میری حیثیت مشیر کی ہے۔ ۱۵ویں صدی ہجری کے آغاز اور پھر کم و بیش تین سال پر پھیلے ہوئے پروگراموں کے بارے میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں انتہائی غور کر کے پوری ذمہ داری اور حد درجہ دیانت کے ساتھ مشورہ دُوں۔ میں اس ذمّہ داری پر خوش بھی ہوں کہ اس تصور کا میں ذمّہ دار ہوں اور مسرور ہوں کہ اب اِس خیال نے ایک عالمی شکل اختیار کر لی ہے۔ بایں ہمہ خائف ہوں کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے کہ جو دیانت و امانت کی تعریف سے خارج ہو جائے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میری رہنمائی فرمائیں، صراطِ مستقیم پر چلائیں اور غلطیوں سے محفوظ فرمائیں۔

ساڑھے آٹھ بجے جناب محترم ظفرالاسلام صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ آج انھوں نے اپنے ساتھ کھانے کے لیے یاد فرمایا تھا۔ کھانے میں آصف علوی صاحب اور ان کی بیگم نیز ڈاکٹر بلگرامی صاحب بھی شریک ہوئے۔ محترمہ بیگم ظفرالاسلام صاحب نے بڑے اہتمام سے کھانا تیار کرایا تھا۔ اُن کی بیٹی اور داماد بھی تھے کہ جو خاطر داری میں شریک تھے۔ میں نے پورے اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ الحمدُ للہ!

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ان کے رزق میں برکت عطا فرمائیں۔

رات ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل واپس آ گیا۔

۱۲ اپریل ۱۹۷۹ء، جمعرات۔ جدّہ

کل جن نکات پر تبادلِ خیال اور غور و فکر ہوا تھا اُن کے بارے میں آج بعض حتمی فیصلے کرنے ہیں۔ ایک اہم تر فیصلہ یہ ہوا ہے کہ اب تک جن ۴۲ ممالک نے اسلام کے نہایت اہم موضوعات پر

عالمی اجتماعات کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کو آج اجتماعات کے لیے حتمی تاریخیں دے دی گئی ہیں۔ آج جناب سیکرٹری جنرل صاحب نے اُن کی آخری منظوری دے دی ہے۔ اب تمام رکن ممالک کو یہ خاکہ عمل جاری ہو جائے گا۔ ضروری کارروائی کر لی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آج یہ فیصلہ بھی ہوا ہے کہ اسلامی سکرٹری ایٹ سے ایک وفد ۲ جون تا ۱۱ جولائی ۱۹۷۹ء ان ممالک کا دورہ کرے گا جو ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں برسرِ عمل ہو رہے ہیں۔ ان کو زیادہ متحرک کرنے کے لیے نیز اُن کو حسبِ ضرورت رہنمائی دینے کے لیے اس وفد کا دورہ ایک اہم ضرورت ہے۔ ہم نے چار کمیٹیاں بنائی ہیں مگر دو کو فوراً کام کرنے کے لیے متحرک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ایک کمیٹی عالمی اجتماعات کے لیے اور دوسری کمیٹی مطبوعات کے لیے۔ وفد میں ان دونوں کمیٹیوں سے کم از کم ایک رکن لیا جائے گا۔ اس وفد کے نتائج حاصل کرنے کے بعد باقی ممالک کا دورہ کیا جائے گا۔ آج ہی پروگرام کے لیے ہدایات دے دی گئی ہیں کہ اس کو مرتب کیا جائے۔

میں نے ۱۵ ویں صدی کے پروگراموں کے لیے رہنما اصول کے طور پر ۱۶ ڈرافٹ تیار کیے ہیں۔ یہ ڈرافٹ اسلامی سکرٹری ایٹ کو دے دیے گئے ہیں۔ اب ان کو عربی اور انگریزی اور فرانسیسی میں تیار کر کے رکن ممالک کو بھجوانا شروع کر دیا جائے گا۔ اس طرح سکرٹری ایٹ رکن ممالک سے روابطِ مزید کے لیے مستعد ہو جائے گا۔ ان ڈرافٹوں کا تعلق بنیادی طور پر پلاننگ سے ہے۔ ہم نے بڑی محنت اس میدان میں کی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ایک سو رہنما اصول مرتب کر کے رکن ممالک کو بھجوانے کا انتظام کیا جائے گا۔ میں اس ضمن میں مسلسل اپنے ذہن کو مصروف کیے رہوں گا۔

کرنسی نوٹوں، یادگاری ڈاک ٹکٹوں اور سکوں کے ڈیزائنوں کے بارے میں پاکستان میں جو اقدامات ہوئے ہیں اسی انداز سے اقدامات کے لیے تمام رکن ممالک کے لیے مسودہ تیار کر دیا گیا ہے اور فوری اقدامات کے انتظامات کر دیے گئے ہیں۔

ہم نے آج یہ طے کیا ہے کہ ایک "نشان" (انسگنیا) ہمیں چند ممالک کے ممتاز آرٹسٹوں کی مدد سے فوراً تیار کر لینا چاہیے۔ اس ذیل میں آج طویل غور و بحث کے بعد ایک ڈیزائن خود ہم نے ذہن میں تیار کر لیا ہے، اور پھر اس کے اچھے بُرے پہلوؤں پر غور کیا گیا اور اس کے بعد اس کو کل تک کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔

وہ ممالک کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اُن کے بارے میں تعاون کی پالیسی آج وضع کر لی گئی ہے۔ یہ سب سے اہم کام ہے۔ الحمد للہ یہ پورا ہو گیا ہے۔ جامعۂ ملک عبدالعزیز میں جو ادارہ متعلق بہ اقلیات مسلم قائم ہے اس کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔ موتمر عالمِ اسلامی سے بھی رابطہ قائم کیا جائے گا۔

خیال یہ تھا کہ ہم اسلامی سکرٹری ایٹ سے ایک نیوز لیٹر (خبرنامہ) نکالیں گے، مگر موجودہ

حالات کا جب جائزہ لیا گیا تو محسوس ہوا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اس کو ختم کر دیا ہے۔ اس کے بجائے وفد کے ذریعہ سے شخصی روابط کو اہمیت دی گئی ہے۔

آخر میں آج جامعۂ کراچی کے جناب ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے بارے میں تبادلِ خیال ہوا اور ان کو آج کراچی ٹیلیکس بھجوا دیا گیا ہے۔ وہ ۲۳ر اپریل تک جدّہ آجائیں گے۔

رات کا کھانا آج جناب کموڈور محمد آصف علوی صاحب کے ہاں کھایا۔ اچھا اجتماع تھا۔ محترمی جناب ظفر الاسلام صاحب، محترمی جناب ڈاکٹر سعید احمد مینائی صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر مینائی صاحب اسلامی بینک کے نگران ہیں۔ ان سے انڈین انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک اسٹیڈیز کے بارے میں تفصیل کے ساتھ تبادلِ خیال کیا۔ ڈاکٹر مینائی صاحب ہمارے اسٹیٹ بینک اوف پاکستان کے ڈپٹی گورنر رہے ہیں۔ اپنے میدان میں بڑے ماہر ہیں۔ میں ان کے خاندان کا ۱۹۵۵ء سے مُعالج ہوں۔ ڈاکٹر مینائی صاحب کی عظمت کا قائل ہوں۔

آج سہ پہر جناب طُور صاحب (پی آئی اے) اور ان کی اہلیہ کے ساتھ بازار گیا تھا۔ میں نے اپنے لیے شیروانیوں کا کپڑا تلاش کیا۔ مل گیا۔ بچّوں کے لیے خوش بُو کی شیشیاں خریدیں۔ اللہ توبہ! بہت پیسے خرچ ہو گئے۔

۱۳ر اپریل ۱۹۷۹ء جمعہ، مکّہ مکرّمہ۔ جدّہ

آج جمعۃ المبارک ہے۔ پروگرام کے مطابق آج صبح ہم مکۃ المکرمہ رَوانہ ہو گئے۔ جناب ڈاکٹر بلگرامی، کموڈور آصف علوی، خواہر من بیگم علوی اور مَیں۔ ایک گھنٹے میں راستہ طے ہو گیا۔ ارادہ کیا کہ پہلے جناب محترم مصطفیٰ الیمنی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ ہم ان کے گھر گئے، مگر وہ غسل خانے میں تھے۔ اندازہ ہوا کہ دیر لگ جائے گی اور عُمرہ نمازِ جمعہ سے قبل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ہم ملاقات کے بغیر حرم شریف چلے گئے۔

الحمد للہ عُمرے کی سعادت نصیب ہوئی۔

ہم سب نے صلوٰۃ التسبیح پڑھی۔ اتنے میں جمعہ کی اذان ہو گئی اور فوراً ہی بعد خطبۂ مسنونہ شروع ہو گیا۔ بہ مشکل چار سنّتیں پڑھی جا سکیں۔ حکم تو یہ ہے کہ اگر خطبے کی اذان ہو جائے اور خطبہ شروع ہو جائے ہو تو چار سنّتوں کی نیّت ہو تو دو کر دینی چاہییں۔ خطبہ مسنونہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

نمازِ جمعہ سے قبل کہ جب میں صلوٰۃ التسبیح پڑھ رہا تھا معلوم ہوا کہ حضرت مولانا یمنی صاحب

تشریف لائے اور میرے پیچھے بیٹھے رہے۔ پھر نمازِ جمعہ کے لیے اگلی صفوں میں تشریف لے گئے۔ نمازِ جمعہ کے بعد میں نے ایک بزرگ کو آتے دیکھا۔ میں نے علوی صاحب سے کہا کہ حضرت یمنی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ وہ مستعد ہو گئے۔ میں نے ان کو آج سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس میرے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو یہی بزرگ یمنی صاحب ہیں۔ میری رائے صحیح تھی۔ میں ادب کے ساتھ اُن سے ملا۔ مجھ سے زیادہ مؤدب محترمی ڈاکٹر بلگرامی صاحب ہوئے۔ علوی صاحب بھی ملے۔ بیگم علوی نے بھی سلام کیا۔ مولانا یمنی صاحب خود میرے قریب تشریف لائے۔ فرمایا: "آپ جو سوچ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے دلچسپی اور حیرانی کے ساتھ ان کا یہ ارشاد سُنا۔ طواف میں اور اپنی ہر دُعا میں، سعی میں اور ہر جگہ آج میں نے اپنے پیارے پاکستان کے لیے دُعائیں مانگی ہیں۔ میرے دل میں وساوس ہیں۔ میں پاکستان کے سیاست دانوں کو صراطِ مستقیم پر نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میرے وطنِ عزیز کو بیرونی خطرات لاحق ہیں۔

کیا مولانا مصطفیٰ الیمنی صاحب نے ان کا جواب دیا تھا؟

مولانا یمنی حرم کے اندر سے باب الجیاد تک آتے آتے کتنی بار مجھ سے متوجہ ہوئے اور ہر بار دُعا کی اور فرمایا: "سب خیر ہو گی۔ راہ صاف ہے، کلیئر ہے۔"

نمازِ جمعہ کے بعد میں سب کو مدرسہ صولتیہ لے گیا۔ وہاں مولانا شمیم صاحب اور اُن کے صاحب زادگان منتظر تھے۔ میں نے ان کو کل بتا دیا تھا کہ یہ قافلہ صولتیہ وارد ہو گا۔ اکل و شرب کا انتظام کر لیجیے گا۔ اپنے لیے میں نے کہا تھا کہ دودھ کا انتظام رہنا چاہیے۔ مولانا شمیم صاحب نے فرمایا: "فکر نہ کیجیے، میں نے دودھ کی شیشی بھی منگوالی ہے!"

مدرسہ صولتیہ سے میرا پُرانا تعلق ہے۔ حکیم محمد نعیم صاحب نے طبیّہ کالج دہلی سے میرے ساتھ فراغت پائی۔ اُن کے بڑے بھائی مولانا محمد سلیم بڑی دلچسپ ہستی تھے اور بڑے تاریخی انسان! اُن کے انتقال کا سب ہی کو دُکھ ہے۔ مجھے بھی بڑا ہی دُکھ ہے۔ اُن کے صاحب زادے مولانا محمد شمیم صاحب ہیں اور اب مدرسۂ صولتیہ کے وہی نگرانِ اعلا ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ مولانا محمد سلیم کے بارے میں ایک کتاب تحریر کریں گے اور شائع کرائیں گے۔ میں نے اس کتاب کا پیش لفظ یا کہنا چاہیے کہ مقدمہ تیار کر کے آج ان کو دے دیا ہے۔ ۴۲ صفحات کا یہ مضمون صولتیہ کی ایک مختصر تاریخ اور محترمی مرحوم مولانا محمد سلیم صاحبؒ کا تعارف ہے۔

مولانا محمد شمیم صاحب نے دو شیروانیوں کا کپڑا نذر کیا۔ میں نے کہا: "بھائی، پرسوں ہی بتا دیا ہوتا۔ میں نے خواہ مخواہ دو اچکنوں کا کپڑا خریدا۔"

اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔

انھوں نے اکل و شرب کا بڑا پُر تکلف انتظام کیا تھا۔ خالص دودھ بھی تھا۔ آئس کریم کیک بھی تھا۔ میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کیک مقامی ہے!

۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء، ہفتہ۔ جدہ

محترمی جناب ظفرالاسلام صاحب اسسٹنٹ سکرٹری جنرل اسلامی سکرٹری ایٹ آج ریاض تشریف لے جانے والے تھے، مگر ہم اپنا کام ختم نہیں کر سکے، اس لیے ان کو اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی اور ہم نے آج تقریباً پونے تین بجے سہ پہر تک بیٹھ کر بہت سے مسائل حل کیے اور ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا ہے۔

حالات کا جائزہ لے کر ہمیں آج یہ بھی طے کرنا پڑا ہے کہ اسلامی سکرٹری ایٹ کا ایک وفد ۲۰ر جون تا ۲۰ر جولائی ۱۹۷۹ء ایک ماہ میں گلف، شرقِ اوسط اور جنوبی افریقی ممالک کا ایک طوفانی دَورہ کرے گا اور ہر ملک میں وہاں نیشنل کمیٹی کے چیرمین نیز وزیرِ نگرانِ تقریبات وغیرہ سے ملاقات کر کے تمام پروگرام کو حتمی شکل دینے میں مدد دے گا، نیز یہ وفد ہر ملک میں ایک پریس کانفرنس بھی کرے گا۔ اس دَورے کے بعد پھر دوسرے اِسلامی ممالک کا پروگرام مرتب کیا جائے گا۔

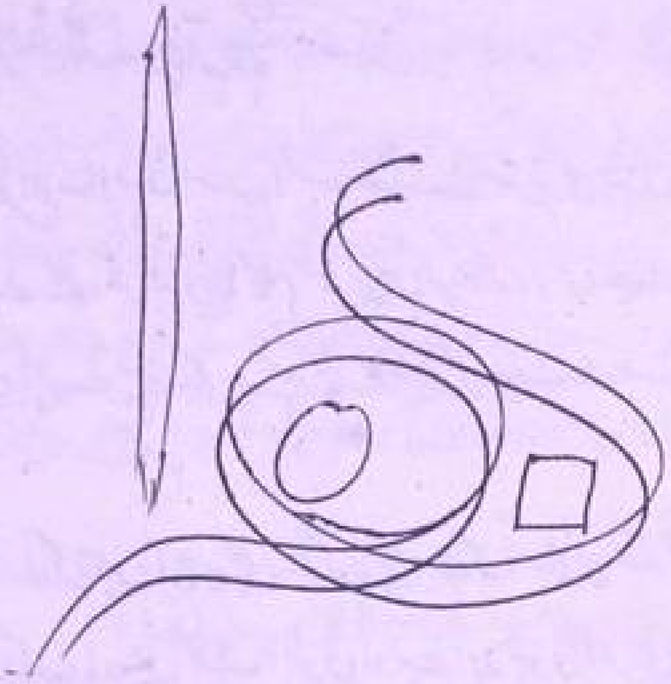
ہم نے یہ مکمل تقریباتِ ۱۵ویں صدی ہجری کی جو ۱۶ نکات پر مشتمل ۱۶ اِسکیمیں مرتب کی ہیں، ان کو اب رکن ممالک کو بھجوانے کا انتظام کیا جائے گا۔ اب میں اس سلسلے کو جاری رکھوں گا۔ اندازہ یہ ہے کہ تمام رکن ممالک کو ہم کم و بیش ایک سو امور پر اس طرح شرح و بسط کے ساتھ رہنمائی دے دیں گے۔

آج بالآخر ایک نشان (اِن سگنیا) کا فیصلہ ہو ہی گیا ہے۔ میرا اصرار یہ تھا کہ اس نشان کی تیاری میں اب ذرا بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے اور اس کو حتمی طور پر تیار کر کے تمام رکن ممالک کو بھیج دینا چاہیے۔

ایک امتیازی نشان (ایمبلم یا اِن سگنیا) کی ضرورت اس لیے ہے کہ صرف اس کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ۱۵ویں صدی ہجری کے آغاز کی علامت ہے اور پھر یہ ایک تاریخ کی حیثیت سے یادگار بن جائے۔ اس امتیازی نشان کو ایک سال تو ضرور ورنہ دو تین سال جب تک تقاریب جاری رہیں اس عرصے میں چھپنے والی ہر شے پر اس کو استعمال کیا جائے گا۔ تمام لیٹر فارموں پر ہر رُکن ملک میں اس کو اختیار کیا جائے گا اور دیگر مطبوعات پر اس اِمتیازی نشان کو جگہ دی جائے گی وغیرہ۔

اس اِمتیازی نشان کے لیے اب تک کئی آرٹسٹ کام کر چکے ہیں۔ اِن ڈزائنوں پر کل بھی غور و فکر ہوا تھا اور آج ہم نے حتمی طور پر اس کو آخری شکل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ بارے آج میرے ذہن میں

ایک روشنی ہوئی اور میں نے دو پنسلیں جوڑ کر حسب ذیل ڈیزائن تیار کر دیا ہے۔ اب یہ آخری فیصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے مروہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے جہاں میں شب گزشتہ خود گیا تھا ان کے آرٹسٹ جناب منظور صاحب کو بلایا تھا۔ ہم نے اپنی یہ ڈرائنگ اب اُن کو دے دی ہے کہ وہ اب اس کو آخری شکل دے دیں۔



یہ دو چشمی ھ ہے۔ اس کے دو خانوں میں سے ایک میں خانۂ کعبہ کی علامت بنائی گئی ہے اور ایک خانہ چشم میں گنبدِ خضرا ہے اور مینارِ مدینہ ہے۔ اگر اس کو غور سے دیکھا جائے تو یہ ۱۵ کا ہندسہ بھی بن جاتا ہے۔

توقع ہے کہ ۸-۱۰ دن میں آرٹسٹ اس کو صحیح انداز سے تیار کر دیں گے۔ میں کراچی میں بھی کوشش کروں گا کہ جمیل نقش صاحب سے اس کو تیار کرا دوں۔ فکر و انداز یہی رہے گا، اب آرٹسٹ، مصور کو اسے اس انداز سے بٹھانا ہے کہ یہ اچھا معلوم ہو۔ اس کے لیے آیتِ کریمہ جناب حسن صاحب نے اچھی تجویز کر دی ہے:

اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی کے انگریزی ترجمے پر غور کیا گیا اور اس ذیل میں مناسب فیصلے کر لیے گئے ہیں جن سے مجھے قلبی اطمینان ہوا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ انشاء اللہ تعالیٰ ۱۵ ویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات کے زمانے میں دار المصنفین اعظم گڑھ یوپی سے شائع ہو گا۔

میں نے تمام تحریرات میں کہ جو اس ضمن میں لکھی ہیں اس آغازِ ۱۵ ویں صدی ہجری کو جشن یا تقریب کہنے سے گریز کیا ہے۔ میں نے یہ اصرار کیا ہے کہ ہم اس موقع کو تبلیغ اور جہاد کا عنوان دیتے ہیں۔ آوازِ اسلام کو کہ آوازِ حق ہے شد و مد کے ساتھ، اور عالمِ اسلام اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اقطار عالم تک پہنچائے گا اور اس آغازِ صدیِ نو پر گزشتہ ۱۴ سو سال کا جائزہ کامل لے کر ۱۵ ویں صدی کے لیے ایک ایسا پروگرام مرتب کر دے گا کہ جو غلبۂ اسلام پر منتج ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ میں نے اسلامی سکرٹری ایٹ میں بھی یہی درخواست کی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ اس خیال کو بنیادی نکتہ قرار دیا جائے اور اس روشنی میں

اب بات کی جائے گی۔

جناب معظم حسین صاحب آج صبح مجھے تلاش کرنے دفتر تشریف لائے تھے۔ وہ مایوس ہو کر جا رہے تھے کہ میں داخل ہوا اور اس طرح اُن سے ملاقات ہو گئی۔ میں ان کو دفتر میں لایا، اُن کی تواضع کی اور اُن سے ذرا دیر تبادلِ خیال کیا اور طے پایا کہ اب شام کو ۳ بجے تفصیلی ملاقات ہوگی۔ میں گزشتہ جنوری ۱۹۷۸ء حیدرآباد دکن گیا تھا، وہاں اُن کے مکان پر قیام کیا تھا، گو جامعہ عثمانیہ ہاسٹل میں منتظمین اسلامی مذاکرے نے میرے قیام کا انتظام کیا تھا، مگر بھائی جان محترم جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب کے ساتھ جناب معظم حسین صاحب کے ہاں مقیم ہوا اور تین دن وہاں بڑے اطمینان سے گزرے۔ جناب معظم حسین صاحب ۲۵ سال یونیسکو سے وابستہ رہے ہیں، اب بھی ریاض (سعودی عرب) میں یونیسکو کی جانب سے مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ۴ مئی ۱۹۷۹ء کو اُن کا کام یہاں ختم ہو جائے گا اور وہ یونیسکو (پیرس) جاکر اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ آج وہ بتا رہے تھے کہ تین ماہ کے لیے یونیسکو اُن کو مالی بھیج رہا ہے۔ وہاں تعلیمات کے ذیل میں ایک رپورٹ تیار کرنی ہے۔ معظم حسین صاحب کا شعبہ تعلیم ہے۔ اب وہ ریٹائر ہو کر اپنے گھر حیدرآباد دکن میں ایک قرآن ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں انھوں نے ذکر کیا تھا۔ آج وہ مجھے اس ذیل میں ایک تفصیلی رپورٹ دے گئے ہیں۔ یہ ایک اسکیم ہے۔ میں نے اس کی ایک نقل جناب ظفرالاسلام صاحب کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔

جمال صاحب ۱۷-۱۸ سال سے جدّہ میں ہیں۔ اب تو وہ سعودی ہیں۔ ان کے خلوص و انس نے آج پھر اُن کے گھر پہنچا دیا۔ جب میں جدّہ آتا ہوں آخری شب کھانا اُن کے ہاں ہوتا ہے اور ان کے ہاں سے مَیں ہوائی میدان آجاتا ہوں۔ آج محترمہ بیگم جمال صاحبہ سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ایک سالن روٹی اور ایک میٹھا اور بس، مگر دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ میں نے شکایت کی تو فرمایا ایک سالن آپ کے لیے ہے باقی اقسام دوسرے مہمانوں کے لیے۔ بڑا پُر تکلف کھانا تھا جسے بغیر تکلف نوش جان کر لیا۔ ایسا سامان کر لیا ہے کہ اب کل رات تک کسی کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جدّہ کا ہوائی میدان اب کافی بڑا ہو گیا ہے۔ انتظامات بھی اب بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ مگر اب ایک نیا ہوائی میدان بن رہا ہے کہ جو دُنیا کا سب سے بڑا ہوائی میدان ہوگا اور دُنیا کے ہوائی میدانوں کی ہر سہولت یہاں میسّر ہوگی۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے عملے نے حسبِ معمول آؤ بھگت کی اور مجھے ہر سہولت بہم پہنچائی۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

ہوائی جہاز میں ایک گھنٹے تک غور و فکر کرتا رہا۔ عملہ جہاز کی خصوصی توجہ کی وجہ سے جگہ اچھی اور آرام دہ مل گئی تھی۔ ہوٹل میں ٹیلی وژن دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ۸ بجے پروگرام بند ہوا اور مکۃ المکرمہ میں

عشا کی اذان ہوئی کہ جو ٹیلے وژن پر ٹیلے کاسٹ ہوئی۔ اس کے بعد ایک علامت اسکرین پر آگئی:

تتوقف لاداء الصلوٰۃ۔ تقریباً دس منٹ کے وقفۂ نمازِ عشا کے بعد پروگرام شروع ہوگئے۔

اس احتیاط کے باوجود سعودی ٹیلے وژن پر امریکی اور مغربی پروگرام بکثرت دکھائے جا رہے ہیں۔ وہی پروگرام جن کی وجہ سے پاکستان میں زوال اخلاق کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ میں نے اس صورتِ حال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق جدہ ٹیلے وژن سے تعلیمی پروگرام اب حذف کیے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان پروگراموں کے وقت لوگ ٹیلے وژن بند کر دیتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں آج صورتِ حال یہ ہے کہ سات ملیون آبادی میں سے ایک ملیون آبادی داخلِ مدارس ہوتی ہے، مگر ان میں سے پچاس فی صد چھٹی جماعت سے قبل غیر حاضر ہو جاتے ہیں، اس لیے تعلیم کا مسئلہ یہاں سنگین ہے۔ ایسی صورت میں ٹیلے وژن ہی ایک ذریعۂ تعلیم ہو سکتا ہے، مگر اس کو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت تعلیم پر متوجہ ہے اور اب بہ کثرت درس گاہیں قائم ہوتی جا رہی ہیں، بایں ہمہ معیارِ تعلیم بلند نہیں ہو رہا ہے اور من حیث المجموع قوم کو تعلیم سے شغف نہیں ہے اور یہ ایک بڑا شدید ملی مسئلہ بن گیا ہے۔

اس صورتِ حال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ افراطِ دولت نے قدرِ زر کو کم اور کم تر کر دیا ہے۔ اس وقت پوری ملت غیر محتاط انداز پر خرچ کر رہی ہے اور بڑی حد تک بے جا اخراجات ہو رہے ہیں۔ کُلُوا وَاشْرَبُوْا کے بعد اسراف کی کوئی حد ہے نہ انتہا ہے۔ وَلَا تُسْرِفُوْا کا کوئی تخیل موجود نظر نہیں آتا ہے۔

برادرانِ ملتِ سعودیہ دنیا کے مختلف ممالک میں یہ شہرت پا چکے ہیں کہ وہ خرچ کرنے میں شاہ ہیں۔ لندن میں وہ اس عنوان جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انڈیا میں بھی ان کی شہرت یہی ہے اور امریکا میں بھی۔ میں اس بے راہ روی کے اسباب سے کوئی بحث کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مگر میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ عدم احتیاط بالآخر تکلیف دہ ثابت ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں دولت کم ہو جائے گی، مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دولت مسلم کردار کو بالآخر ضائع کر دے گی اور اس کے مظاہر آج ہی بدیہی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا دل چاہتا ہے کہ سعودی عرب اس دنیا کی سب سے عظیم مملکتِ اسلامیہ بن جائے جسے ہم اسلام کے معیارات کے مطابق ایک رفاہی مملکت کا عنوان دے سکیں۔ اس کے لیے جس پلاننگ کی ضرورت ہے اس حالت میں اس کا فقدان دیکھتا ہوں اور میرا دل دکھتا ہے۔ الحمد للہ اس وقت اس مملکتِ اسلامیہ کو جو خوش حالی نصیب ہے اور جس کی وجہ سے بہت سے ممالک بہ شمول پاکستان آرام کی نیند سوتے ہیں، اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس خوش حالی کو دوام دینے کی ہر ممکن سعی کی جائے اور قبلۂ مسلمانانِ عالم کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ کبھی اسے کوئی خطرہ

لاحق ہی نہ ہو۔ اس وقت صورتِ حال یہ نہیں ہے۔

مقامِ مسرّت ہے کہ حکومت سعودی عرب علمی سرپرستی اور عالم دوستی کے سامان پر پوری طرح متوجہ ہے۔ میں نے ۱۹۷۷ء میں اولین تعلیمِ اسلامی کانفرنس مکۃ المکرمہ میں اس ذیل میں ایک تجویز پیش کی تھی کہ مکۃ المکرمہ میں پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک مرکزِ علم و ثقافت قائم کر دیا جائے اور یہاں اس مرکز کی روشنی سے سارے عالمِ اسلام کو منوّر کرنے کا سامان کیا جائے۔

بے اندازہ اور بے حساب دولت سے مملکتِ سعودیہ اور عالمِ اسلام کو بے اندازہ اور بے پناہ طاقت بخشی جاسکتی ہے۔ اس طرف پوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس میدان میں جو اخراجات کیے جائیں ان کا حاصل بھی ہونا چاہیے اور فائدہ بھی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ یہ مملکتِ سعودیہ ایک ایسی مملکتِ اسلامی بن جائے کہ باہر کی دُنیا سے جو فرد بھی یہاں آئے اس کے لیے یہاں سامانِ تربیت ہو۔ وہ جتنا عرصہ یہاں رہے روشنیِ اسلام اس کی فکر و عمل کے لیے رہنما ہو اور جب وہ اس مملکت سے باہر جائے تو مسلمان کامل بن کر جائے۔ گویا پورا ملک عالمِ اسلام کی ایک تربیت گاہ کی حیثیت حاصل کرلے۔

جدّہ اور ریاض دو شہر ایسے ہیں کہ جہاں تعمیرات کی رفتار شاید دُنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہے۔ سالِ گزشتہ میں فن لینڈ میں تھا۔ وہاں ایک جزیرے میں سامانِ تعمیر ڈھل رہا تھا، یعنی برآمدے، چھجے، دیواریں وغیرہ سیمنٹ سے تیار ہو رہی تھیں۔ بتایا گیا کہ اِس سامان کا ۹۰ فی صد سعودی عرب اور کویت جارہا ہے۔ میں نے بعض تعمیرات کو غور سے دیکھا۔ یہاں واقعی فن لینڈ کا ویسا سامان لگ رہا تھا کہ جو میں نے وہاں خود دیکھا تھا۔ جدّہ میں موٹر کاروں کی وہ کثرت ہے کہ اب مستقبل قریب میں پورے شہر کی سڑکیں ڈبل کرنی ہوں گی، یعنی سڑک کے اوپر سڑک (پُل) تعمیر کرنا ہوگا ورنہ موٹریں چلنے کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔ اس وقت جدّہ شہر میں کم و بیش ساٹھ ہزار موٹریں خراب کھڑی ہیں اور جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ موٹر کاروں کی یہ کثرت بجائے خود غور طلب ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء، اتوار، کراچی

سعودی عرب وقت کے مطابق ۱۲½ بجے شب پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کا طیارہ ڈی سی ٹین روانہ ہوا اور کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے میں اس نے کراچی لاکر اُتار دیا۔ کراچی میں صبح کے ۵½ بجے تھے۔ میں نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ جہاز میں سو کر گزارا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں جہاز سے اتر کر سیدھا مطب ہمدرد پہنچ جاؤں گا۔ سعدیہ بیٹی سے غلطی ہوگئی کہ انھوں نے میری آمد کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

ہوائی میدان پر عملۂ ہمدرد کے جناب حامد حسین صاحب نہ آسکے اور مجھے اپنے سامان کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ ورنہ معمولاً میں ہوائی جہاز سے اتر کر گھر یا دفتر آجاتا ہوں اور سامان حامد حسین صاحب لے آتے ہیں۔ خیر میں تیار ہو کر ۸ بجے مطب ہمدرد آگیا۔ یہاں وہی ہوا کہ جس کا امکان تھا۔ اطلاع نہ تھی، مریض آئے اور اگلے اتوار کے لیے وقت لے کر چلے گئے۔ میں ۱۲ بجے تک مصروف رہا اور ۲۰۰ مریضوں کی خدمت کا موقع مل گیا۔

دفتر ہمدرد آگیا۔ خاصا وقت کارکنان سے ملاقاتوں میں صرف ہوا، مگر کام بھی جاری رہا۔ بہت سے فائل سامنے آئے۔ ان پر ضروری ہدایات دے دیں۔ میری عدم موجودگی میں جو خطوط ممالکِ غیر سے آئے تھے اُن کو آج دیکھ لیا ہے۔ کل ان کے بارے میں ضروری ہدایات دے دُوں گا۔ آج ایسٹر ہے، میری سکرٹری آج چھٹی پر ہیں۔

چھ بجے گھر آگیا۔ غسل کر کے میں کام کے لیے بیٹھ گیا، مگر ایسا محسوس ہوا کہ ذہن کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ حساب تیار کرنا چاہتا تھا، مگر ایک بھی چیز یاد نہ آئی۔ آخر قلم رکھ دیا اور نمازِ مغرب ادا کر کے اخبارات دیکھتا رہا۔ پھر بچّوں میں آکر گھل مل گیا۔ رات ۱۰ بجے سو گیا۔

۱۶ر اپریل ۱۹۷۹ء، پیر

محترمی ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے ٹیلے فون پر بات کی۔ وزارتِ صحت نے میرے مشورے کے خلاف جو طبّی ریسرچ کمیٹی بنائی ہے اس کی صدارت میری تجویز کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو عطا فرمائی ہے۔ یہ طبّی ریسرچ کمیٹی اُس مشورہ و تجویز کے بالکل خلاف ہے کہ جو مَیں نے تجویز کی تھی اور اس سے اچھی کمیٹی کا تصور ممکن نہیں ہے، کیوں کہ طبّی اور بنیادی ریسرچ کا جو تصور ہے اور جو خواب ہے وہ ایک مناسب و معقول تجویز اور کمیٹی کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ وزیرِ صحت اور وزارتِ صحت دونوں کو یہ تعمیری کام ناپسند ہے۔ وزیرِ صحت طب کے نادان دوست ہیں اور وزارت دانا دشمن۔ ایک ایسی کمیٹی کی صدارت کہ جس سے معقولیت کی کوئی توقع نہیں اور طبّی ریسرچ کا کوئی امکان نہیں پاکستان بلکہ دنیا کے اس عظیم سائنس داں کا وقت اس میں خراب کرانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ میں نے ان کو مشورہ دیا ہے کہ کمیٹی کا اجلاس بُلانے میں تامّل اور توقف فرمائیے تاآنکہ مَیں حالات کو درست کر لُوں۔

آج ہمدرد کی مجلسِ منتظمہ کا جلسہ ہوا۔ میں نے حسبِ معمول اس میں شرکت کی اور کاروباری مسائل پر ڈھائی گھنٹے تبادلِ خیال کیا اور مناسب مشورے دیے اور راہِ عمل تجویز کی۔ آج ایک

تکلیف دہ صورت پیدا ہوگئی اور میرے مزاج میں برہمی پیدا ہوگئی۔ مسئلہ تھا نونہال گرائپ واٹر کا۔ میں سالِ گزشتہ سے اس کے لیے مسلسل کام کر رہا ہوں۔ اس کا نباتی فارمولا مرتب کرنے میں پورا برس لگ گیا۔ برادرِ عزیز ڈاکٹر حافظ محمد الیاس مصروفِ فکر اور دُوسرے کیمسٹ مشغول۔ میں نے نونہال کی تیاری کے لیے ضروری مشینیں مغرب سے فراہم کی ہیں۔ پیکنگ ہال مرتب کرایا ہے۔ کارکنان نئے بھرتی کیے ہیں۔ تشہیر کے لیے میں نے اپنی نگرانی میں سامان تیار کرایا ہے۔ اخبارات کے لیے ڈزائن مرتب کیے ہیں، عبارات لکھ دی ہیں۔ پورا کمپین تیار ہے، مگر نونہال کی قیمت میں اضافے کا فیصلہ میرے مشورے کے بغیر کر لیا گیا اور جاری کر دیا گیا۔ یہ غلطی تھی اور شدید کہ اس نے میرے مزاج کو سخت برہم کر دیا ہے۔ برہمی کے ایسے مواقع میری زندگی میں بڑے شاذ ہیں۔

جب میں ہمدرد کی اس مجلسِ منتظمہ میں بیٹھتا ہوں تو حالاتِ وطن کی بڑی خراب تصویریں سامنے آتی ہیں۔ کاروبار میں کیسی شدید مشکلات درپیش ہیں ان کو دیکھتا ہوں اور کُڑھتا ہوں۔ کوئی معاملہ اور کوئی اقدام رشوت اور خاطر تواضع کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے نہ جانے کیسے کیسے نقصان اٹھائے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن سے کاروباری معاملات ہیں اُن کی بے اصولیاں اور بے ایمانیاں معراج پر ہیں۔ آج راولپنڈی کی ایک گلاس فیکٹری کا معاملہ سامنے آیا جس نے لاکھوں رُپے پیشگی لے کر بھی مال پُورا فراہم نہیں کیا ہے اور یہ اطلاع دی ہے کہ فرمائش منسوخ۔ اس گندہ ذہنیت نے ہمدرد کے پروگرامِ صنعت کو ایک زبردست دھکا لگایا ہے۔ میں نے مشورہ دیا ہے کہ مسئلہ یہ ہے کہ دام بڑھانے جائیں۔ بس جائیے اور منھ مانگے دام دے دیجیے، مسئلے کا حل یہی ہے۔ ابھی یہ گفت گو جاری تھی کہ اس کمپنی کا تار آگیا کہ سوڈا ایش وغیرہ کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے اب بوتل کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا!

زوالِ اخلاق کی شدید کیفیت اور ایک شدید بحران نے جکڑ لیا ہے اور عقل حیران ہے کہ دیانت و امانت اور دستور و قانون کا احترام آخر کس طرح کیا جائے۔

میری اہلیہ کی حقیقی بہن خورشید بیگم علیل ہیں، داخلِ ہسپتال ہیں۔ ہمدرد دفتر میں شام ۶ بجے کام ختم کر کے ان کو دیکھنے ہسپتال گیا۔ مزاج پُرسی کی۔ ڈاکٹر جمعہ اُن کو دیکھ رہے ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر ماموں زاد بہن رحمانی بیگم کے ہاں گیا۔ یہ بہن گزشتہ ماہ بیوہ ہوگئی ہیں۔ آج بیسویں کی فاتحہ تھی۔ دل گرفتہ یہاں سے واپس گھر آیا اور رختِ سفر باندھا کہ اب اسلام آباد روانگی ہے۔ اور میرا رختِ سفر کیا! فائل اور کاغذات! ان کو مرتب کر کے بیگ میں بھرا۔ بیگ میں جدہ کے جو فائل تھے اُن کو میز پر مرتب کیا تاکہ اسلام آباد سے واپس ہو کر اس کام کو کر لوں۔

کراچی کے ہوائی میدان سے جہاز ۹ بجے روانہ ہوا اور اس اعتبار سے اسلام آباد آدھ گھنٹہ تاخیر سے اترا۔ ہوائی میدان پر عزیزم عبدالستار صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر آگیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۷۹ء، منگل، راولپنڈی، اسلام آباد

دنیا بھر میں یہ قاعدہ ہے کہ شاہراہوں پر مرمت وغیرہ کا اگر کوئی کام ہو تو رات کے وقت کیا جاتا ہے کہ جب سڑکوں پر آنا جانا کم ہو، مگر ہمارے ملک میں یہ دستور ہے کہ جب مزدور کا دل چاہے کام کرتا ہے۔ راولپنڈی سے اسلام آباد جانے والی سڑک پہلے ہی تنگ ہے۔ آج عین اُن اوقات میں کہ لوگ اپنے کاموں پر جا رہے ہیں، دفتروں کی طرف بھاگ رہے ہیں، سڑک کی کھدائی شروع کر دی گئی ہے اور سڑک بند ہو گئی ہے۔ اب سڑک کے دُوسرے حصے پر ٹریفک کا زور ہو گیا ہے اور سینکڑوں موٹریں، بسیں وغیرہ جمع کر رہ گئی ہیں۔ بہ مشکل گزر ہو سکا اور میں اپنے دفتر (پاکستان سکرٹری ایٹ، بلاک ڈی) دس منٹ تاخیر سے پہنچا۔ یہ میرے معمول کے خلاف ہے، میں وقت کی بڑی سخت پابندی کرتا ہوں۔

آج میں نے ان خطوں پر دستخط کر دیے ہیں کہ جو متعدد اُن ممالک کے وزرائے صحت کو میں بھجوا رہا ہوں کہ جن کے ہاں سگریٹ نوشی کی ممانعت وغیرہ کے قوانین بن چکے ہیں۔ قوانین کے یہ حوالے میں نے انٹرنیشنل کینسر ایسوسی ایشن (UICC) جینوا سے منگوائے تھے۔ ان دساتیر و قوانین کا مطالعہ کروں گا اور پاکستان کے لیے ایک مسودۂ قانون مرتب کروں گا۔ پاکستان میں مسائلِ صحت کے پیشِ نظر یہ اقدام ضروری ہے اور ناگزیر۔

آج پھر میں نے محسوس کیا کہ دفتر میں عدمِ تعاون کی فضا ہے۔ اس سے مجھے بڑی شدید ذہنی تکلیف ہوئی اور آج میں نے صورتِ حال کی اصلاح کا فیصلہ کر لیا اور میں نے درخواست کے بجائے حکم کا راستہ اختیار کیا جو میرے مزاج اور میری طبیعت کے سراسر منافی ہے۔ میں نے ہمدرد میں ۱۹۴۸ء سے بھائی چارے کی فضا قائم کی ہے۔ میں نے پاکستان میں سب سے پہلے ہمدرد میں کام کرنے والوں کو ملازم کہنا ممنوع قرار دیا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں نے لفظ کارکن اختیار کیا اور اس کارکن کو عملاً رفیقِ کار کا درجہ دیا۔ میں نے کارکنانِ ہمدرد سے ہمیشہ محبت کا سلوک کیا اور یہ دیانت داری کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ میرے اپنے ہیں۔ حکم نہیں دیا، بچوں کی طرح کام لیا۔ میں نے ہمدرد میں سب سے پہلے ایک ایسی بونس اسکیم نافذ کی کہ جو کارکن کو عملاً شریکِ کاروبار بناتی ہے۔ میرا آج بھی یہ یقین ہے کہ میری مرتبہ بونس اسکیم اختیار کر لی جاتی تو پاکستان میں آجر و اجیر کے مابین ایسی محبت و یگانگت پیدا ہوتی کہ جس کی کوئی مثال نہ ہوتی۔ میری مرتبہ اسکیم میں اسلامی سلوک کی شان موجود تھی۔ اسی طرح میرے کارکنان نے ہمدرد سے محبت کی اور مجھ سے اُنس کیا۔ اس کی مثالیں باید و شاید ہیں۔ مگر پھر ایک ایسا دَور آیا کہ زوالِ اخلاق داخل ہو گیا۔ وہ کارکنانِ ہمدرد کہ جو قریب ترین عزیز تھے اور ہمدرد نے اُن کی

پشت پناہی کی تھی وہی باغی سَردار بن گئے، حتیٰ کہ ایک بار انھوں نے میرا ۴ - ۵ گھنٹے سخت گرمی میں گھیراؤ بھی کیا - یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے جب میں بیمار تھا اور جگر میرا تباہ اور تلّی میری خراب تھی - گھیراؤ کے وقت میں مجھے شدید یرقان تھا اور میں موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھا مگر ناغہ کیے بغیر ہمدرد کا کام کر رہا تھا، مطب کر رہا تھا، حتیٰ کہ ایک دن مطب میں بے ہوش ہوگیا - اس کے بعد جب میں باہر اپریشن کے لیے گیا تو میں نے انھی کارکنان کو محبّت سے خدا حافظ کہا اور سب سے پہلے حرمین شریفین میں جاکر ان سب کے لیے دستِ دُعا دراز کیا اور اب بھی جب میں عُمرہ کرتا ہوں ہمدرد کے ہر کارکن کے لیے خوش حالی کی دُعا کرتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ اُن کے مراتب بلند تر ہوں -

میں نے ہمدرد میں اپنے کارکنوں سے اس طرح محبّت کی ہے - میں آج بھی ان سب سے محبّت کرتا ہوں، حال آں کہ ان میں سے شاید ۷۵ فی صد لوگ اب نہ مخلص ہیں اور نہ محب ہیں - نہ وہ امانت دار ہیں اور نہ دیانت دار، تاہم میرے عزیز ہیں اور بچّے ہیں -

میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں منتظمۂ ہمدرد کو ہدایت دی کہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کردیا جائے - منتظمہ نے ۲۵ لاکھ رُپے سالانہ تنخواہوں میں اضافہ کردیا - میں ان سے اب بھی محبّت کرتا ہوں اور وہ اب بھی ادارے کی بیخ کنی کی راہ اختیار کرتے ہیں - صبح ۱۰ بجے کام شروع کرتے ہیں - ۲ بجے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں، کام نہیں کرتے، کام کرتے ہیں تو وقت کے بعد جو کام کرنا ہوتا ہے وہ کرتے ہیں اور اوور ٹائم لے کر چلے جاتے ہیں اور ذرا غور نہیں کرتے کہ وہ دیانت و امانت میں کہاں ہیں اور اس غلطی کی سزا اُن کو خود دنیا میں بھی ملے گی اور آخرت میں بھی - بس میں ان کے لیے طواف میں دُعائے خیر کرتا ہوں اور شاید وہ اس لیے عذاب سے محفوظ ہیں - میں اپنا طریقہ جاری رکھوں گا، کبھی تو انشاءَ اللہ امانت اور دیانت کا دَور دَورہ ہوگا -

میں وزارتِ صحت کے دفتر میں آج برہم ہوگیا اور میں نے حکما کے آج تمام فائل طلب کیے اور ضروری کاموں کو آگے بڑھایا - میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وزیرِ صحت طب کے نادان دوست ثابت ہوئے - انھوں نے طب کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اُس کا احاطہ ممکن نہیں ہے - وہ نہ طب کو جانتے ہیں اور نہ صحت کو سمجھتے ہیں، مگر دخل اندازی اُن کا مزاج - اُن میں رعونتِ مزاج بھی اور سیاسی اَنا اُن کی بیدار - میں نے اُن کا احترام کیا، مگر طب کا انھوں نے ذرا بھی احترام نہ کیا - ایسی حالت میں عمالِ وزارت ان کے ہمنوا ہوئے - انھیں اس سے بہتر کیا نسخہ مل سکتا تھا!

مَیں نے آج عالی مرتبت صدر گرامی قدر کو ایک مفصّل تحریر بھجوادی ہے کہ موجودہ صورتِ حال طب وصحت کے مفاد میں نہیں اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے - ان کو اس امر پر توجہ عالی مبذول

کرنی چاہیے۔

جناب مسرت حسین زبیری میرے عزیز از جان دوست ہیں۔ معلوم نہیں کہ کس خمیر سے ان کی تعمیر ہوئی ہے۔ توازن اور اعتدال اُن کی سرشت ہے۔ محبت و اُنس اُن کا کردار ہے۔ فہم و فراست قدرت نے اُن کو بے اندازہ ودیعت فرمائی ہے۔ حلم اور بُردباری اُن کی ادا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے میں ان کا دوست ہوں اور وہ میرے دوست۔ ہمارے درمیان اس عرصۂ طویل میں ایک بار بھی کوئی اِختلاف نہیں ہوا۔ میں آج ڈھائی بجے دفتر سے اُٹھ کر سیدھا اُن کے پاس گیا۔ محترمہ بیگم زبیری صاحبہ نے دودھ اور پاپے تیار کر رکھے تھے۔ میں نے ناشتا کیا۔ ایران کا ذکر آیا، خلعت باری صاحب کا ذکر آیا جن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ زبیری صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا بھی اُن سے رابطہ تھا۔ جناب عباس ہویدا کو گولی مار دی گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اُن سے ہم دونوں واقف تھے۔ سالِ گزشتہ امیر عباس ہویدا صاحب نے مجھے ایک کتاب ہدیتہً بھجوائی تھی۔ نہ جانے ایران میں اور دوستوں کا کیا حال ہے! حمید اور مجید رہنما کہاں ہیں اللہ ہی جانے۔

مسرت حسین زبیری صاحب سے مل لیا، دل کو قرار آگیا۔ گھر آگیا اور مضامینِ ہمدرد صحت کا فائل نکال کر رات آٹھ بجے تک مضامین تیار کرتا رہا۔ پاکستان مڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل کی قرارداد آج سامنے آگئی ہے۔ ان سے میں بڑا متاثر ہُوا ہوں اور حیران ہوں کہ اس دَور میں بھی فنی تعصب اس معراج کو پہنچ سکتا ہے جہاں پاکستان کے ڈاکٹروں نے اسے پہنچا دیا ہے! ان کا اصرار ہے کہ طب کو طبِ اسلامی نہ کہا جائے۔ اگر ہندو طب کا نام آیورویدک رکھتا ہے اور چین طبِ چینی کہتا ہے تو صحیح ہے۔ عرب طب کو طبِ عربی / اسلامی کہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ سری لنکا سِدھا کا نام دے تو درست، پاکستان میں صدرِ مملکت طبِ اسلامی کہیں تو اس نام میں ہزاروں کیڑے اور صدہا عیب۔

پاکستان مڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل کا اصرار یہ ہے کہ صدرِ مملکت اپنے اس فیصلے کو واپس لیں کہ پاکستان کے طبیہ کالجوں میں ڈاکٹر جاکر پڑھایا کریں۔ صدرِ مملکت نے درحقیقت عین اسلامی بات کہی ہے۔ اشاعتِ علم فریضہ ہے۔ مجھے جو علم آتا ہے اُسے دوسروں تک پہنچانا عبادت ہے، حُسنِ اخلاق ہے اور حُسنِ سیرت۔ مگر پاکستان کی یہ کاؤنسل مُصر ہے کہ کوئی ڈاکٹر طبیہ کالجوں میں جاکر تعلیم نہیں دے گا۔ پاکستان میں گنتی کے ۸-۹ طبیہ کالج ہیں۔ ان میں شاید مجموعی طور پر ۵-۶ ڈاکٹر تعلیم دیتے ہیں، مگر یہ کاؤنسل اس کو گوارا نہیں کرتی۔ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ بات اصولی ہے اور میری رائے ہے کہ صدرِ مملکت کو اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ ان کا فیصلہ عین اسلامی ہے اور اخلاقی ہے۔ اور ان ڈاکٹروں کا اصرار قطعی طور پر غیر انسانی ہے اور شرافت سے بعید ہے۔ میں نے ہمدرد صحت کے لیے اس موضوع پر ایک اداریہ لکھ دیا ہے۔

آج قومی اتحاد کے وُزرا کابینہ حق سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ اُن کے اعزاز میں آج مہمان خانۂ صدر میں صدرِ مملکت نے الوداعی ڈنر دیا تھا۔ اپنی تقریر میں جنابِ صدر نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان وزرا نے ان کا بہترین ساتھ دیا ہے اور اُن کے بہترین تعاون سے پاکستان میں نظامِ اسلامی کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ غرض حُسنِ کلام اور حُسنِ اخلاق تھا کہ جو صدرِ گرامی قدر کے ہر لفظ سے عیاں تھا۔ توقع تھی کہ ان ۱۲ جانے والے وزرا میں سے کوئی ایک جوابی تقریر میں صدرِ گرامی قدر کا بھی شکریہ ادا کرے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ میں نے اس کمی کو محسوس کیا ہے۔

مجھے علاحدگی میں جناب صدر نے یاد فرمایا اور کہا: اِس تبدیلی سے آپ متاثر نہیں ہیں، آپ اپنا کام جاری رکھیے گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ میں نے جو آج خط بھجوایا ہے اُسے ملاحظہ فرمالیجیے گا۔ مجھ سے محترمی جناب بریگیڈیر ظفر صاحب ملٹری سکرٹری کہہ چکے تھے کہ خط مل گیا ہے اور کل صبح پیش کروں گا۔ جب میں نے خط کا ذکر کیا تو جناب صدر نے بریگیڈیر صاحب کی طرف استفسار کے طور پر دیکھا۔ میں نے فوراً کہا کہ خط بریگیڈیر صاحب آپ کو پیش کریں گے ــــــــ "میں ضرور پڑھوں گا۔"

۱۸ اپریل ۱۹۷۹ء، بدھ، راولپنڈی/ اسلام آباد

صبح تین بجے بیدار ہو گیا۔ نمازِ تہجد ادا کر کے اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ گزشتہ ۱۵ دن کے اخبارات کو جو یہاں جمع تھے ان کو دیکھا اور خود کو حالاتِ وطن کے بارے میں گویا "اَپ ٹو ڈیٹ" کر لیا ہے۔ اخبارات کی خبروں پر نشان بھی لگا دیے ہیں، تاکہ حسبِ معمول لائبریری میں ان کو تراش کر متعلقہ فائلوں پر لگا دیا جائے۔ وزرائے قومی اتحاد کہ جو الگ ہو رہے ہیں اور اُن کا یہ فیصلہ حقیقت پسندانہ ہے، اُن کے تمام بیانات وغیرہ کو میں نے بڑی احتیاط سے محفوظ کر دیا ہے۔ ہمدرد لائبریری سے یہ تمام حوالہ جات مل سکتے ہیں۔

۸ بجے ٹھیک میں اپنے دفتر (بلاک ڈی پاکستان سکرٹری ایٹ) آ گیا۔ فائلوں کے بارے میں آج گویا میں نے "شور مچا دیا" اور مجھے بالآخر تمام فائل مل گئے اور میں نے ان پر فوری ضروری کارروائی کر دی ہے۔ ان فائلوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ طب کی راہ میں رکاوٹوں کی دیواریں دبیز ہوئی ہیں۔ میں نے طبی ریسرچ کمیٹی کا فائل اپنے پاس رکھ لیا ہے، تاکہ روانگی کے وقت نادان دوستی کی کوئی چھاپ اس پر نہ لگا دی جائے۔

وزارتِ صحت میں اپنے دفتر میں مریضوں کے رجوع سے گریز کرتا ہوں مگر میری بہ حیثیتِ طبیب بعض دوستوں کے لیے وجۂ طمانیت ہے۔ میں ان کی خدمت کرتا ہوں۔ دفتر سے محترمی جناب مسرت حسین زبیری صاحب کے پاس گیا تھا۔ اُن کے ہاں اُن کے باغ کے کھٹے لوکاٹ اور امرود کے کچالو نوش جان

کر کے اُن سے رخصت ہُوا - گھر جاتے ہوئے ایک طبّی مشورے کے لیئے "عالمِ بالا" گیا اور یہاں اپنا ایک نوٹ چھوڑ دیا - یہاں وہ مسجد دیکھی کہ جو ابھی یہاں تعمیر ہوئی ہے اور جہاں ظہر کے وقت پاکستان کی طاقت اُونی بارگاہ باری تعالےٰ میں سر بسجود ہوتی ہیں - دل خوش ہو گیا - دل چاہتا تھا کہ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کا جہاز آج ذرا لیٹ ہو جائے اور میں سفیر چین در پاکستان کے استقبالیے میں شریک ہو جاؤں جن کی جانب سے دعوت نامہ وزارتِ خارجہ نے بغیر کسی مشورے کے مجھے کراچی بھجوا دیا تھا - مگر اب پی آئی اے "آلویز ان ٹائم" ہے! اس لیے میں ۷ بجے راولپنڈی سے رَوانہ ہو کر ۹ بجے کراچی آ گیا -

میں نے محسوس کیا کہ آج میں تھکا ہُوا ہوں!

۱۹ اپریل ۱۹۷۹، جمعرات

میری ذہن کی گھڑی نے مجھے تین بجے بیدار کر دیا اور میں حسبِ معمول چار بجے اپنے ڈیسک پر آ گیا - میری کوشش یہ ہے کہ میں ۳ - ۴ دن کے اندر ان اوقاتِ صبح میں اسلامی سکرٹری ایٹ جدّہ سے جو کام لایا ہوں اُس کو ختم کر کے بذریعۂ وزارتِ خارجہ جدّہ بھجوا دُوں گو میں ۱۶ اہم پروگرام تیار کر کے وہاں گزشتہ ہفتے دے آیا ہوں، مگر ہنوز باقی ہے - آج ۷ بجے تک میں نے یہ کام خاصا کر لیا ہے -

جسم کو ورزش کی بڑی ضرورت ہے - میں دو سیٹ ٹینس کھیلنے چلا گیا - ایک گھنٹے میں اچھی ورزش ہو گئی ہے - موسم آج اچھی ٹینس کے لیے سازگار نہ تھا، مگر ورزش کے لیے بُرا نہ تھا -

مدینۃ الحکمت - آزمائش

۱۱ بجے ٹھیک میں زون سی کے جناب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے دفتر پہنچ گیا - آج انھوں نے ازراہِ لطف و کرم وقت دیا تھا اور مَیں اُن سے "مدینۃ الحکمت" کے بارے میں تبادلِ خیال کرنا چاہتا تھا - اسلام آباد سے ایک دن قبل اس مقصد کے لیے شب گزشتہ آیا ہوں - سب سے پہلے صدر دروازے پر روکا گیا، یہاں مجھے وہ خط دکھانا پڑا کہ جو تقرریِ وقت کے لیے مجھے ملا تھا - اندر جانے کی راہ مل گئی - اس کے بعد عمارت کے صدر دروازے پر روکا گیا - میں نے اپنا نام بتایا، کام بتایا - اوپر جانے کا راستہ مل گیا - اُوپر میں اے ڈی سی صاحب کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ پھر دو نوجوانوں نے راستہ روک لیا - ان کو سب بتایا اور اس طرح مَیں اے ڈی سی صاحب کے کمرے میں پہنچ سکا جنھوں نے مجھے انتظار کرنے کی ہدایت کی میں جانتا تھا کہ برطانیہ کے سفیر اندر ہیں جن کی موٹر کار میں نے عمارت کے صدر دروازے پر کھڑی دیکھ لی تھی - میرا وقت ۱۱ بجے سے ۱/۲ ۱۱ بجے تک کا تھا، مگر تقریباً ۱۳ منٹ مجھے انتظار کرنا پڑا - سفیرِ برطانیہ قونصل جنرل

برطانیہ کے ساتھ باہر آئے۔ قونصل جنرل مجھے جانتے تھے، خلوص سے آکر ملے یا شاید تپاک سے۔ مگران دونوں میں سے ایک نے بھی کلمۂ معذرت نہ کہا کہ انھوں نے وقت زیادہ لے لیا۔ جب کوئی قوم اپنے مقام سے گرتی ہے تو اُس کے اخلاق بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔

جناب گورنر صاحب نے خیر مقدم کرتے ہوئے زحمتِ انتظار پر کلماتِ عذر ارشاد فرمائے۔ یہ اُن کی شرافت وعظمت۔ میں مدینۃ الحکمت کی بات کرنے آیا تھا کہ میری زندگی کا اب صرف یہ ایک کام ہے جو میں کر گزرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اپنی عمر ۸۰ سال سمجھ لوں تو ۳/۴ تو ختم کر چکا ہوں ۱/۴ باقی ہے، چاہتا ہوں کہ اِس عمرِ عزیز میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے بھرپور کام لے کر پاکستان کو ایک شہرِ علم دے جاؤں، جس کی پلاننگ کے لیے میں نے نہ جانے اب تک کتنی چیزیں دیکھ لی ہیں۔

مدینۃ الحکمت کے لیے مَیں ایک سو ایکڑ زمین رعایتی قیمت پر بلکہ انتہائی رعایتی قیمت پر خریدنا چاہتا ہوں۔ عالی جناب گورنر صاحب سے مَیں یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ

(الف) میری اسکیم کو وہ سمجھ لیں، شاید اُن کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اس وطنِ عزیز میں کام کر گزرنے والے بھی ہیں۔

(ب) زمین کے حاصل کرنے میں جو مسائل ہیں اُن کو جلد حل کرا دیں تاکہ تاخیر کے بغیر کام شروع کر دیا جائے۔ اس سال ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے بجٹ میں ۲۵ لاکھ رُپے کام شروع کرنے کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اگلے سال یہ رقم انشاءاللہ تعالیٰ ۵۰ لاکھ ہو جائے گی اور پھر ہر سال بڑھتی رہے گی۔

(ج) زمین کی قیمت انتہائی رعایتی لگا دیں، کیوں کہ یہ میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ میں اِس شہرِ علم وثقافت کو قوم اور ملک کے لیے تعمیر کر رہا ہوں۔

"ایک سو ایکڑ زمین پر"۔ جناب گورنر صاحب نے فرمایا: "ایک سو ایکڑ زمین بہت زیادہ ہے"۔ اِس جملے نے میرے تمام نظامِ جسمانی واعصابی کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ گورنر صاحب نے مجھے شُوٹ کر دیا ہے، گولی نے مجھے لہولہان کر دیا ہے۔ اس جملے کا میں نے اُس وقت یہ مطلب لیا کہ جناب گورنر صاحب نے کہا ہے: "حکیم سعید! تم جھُوٹ بول رہے ہو!"

لیکن خیال کی رَو آگے بڑھی تو مَیں نے سوچا کہ گورنر صاحب کا یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ میں زمین کی ضرورت بتانے میں مُبالغہ کر رہا ہوں۔ بہر حال میں خیالات میں ڈوبا ہُوا اپنی دُوسری منزل پر پہنچ گیا، لیکن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ قلم میرے ہاتھ سے چھُوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میں نے اپنی بات تین چار منٹ میں ختم کر دی اور اٹھ کر آ گیا۔ راہ میں یہ سوچتا رہا کہ بی بی سی میں اور حکیم سعید میں

گورنر صاحب کو بہر حال فرق و امتیاز قائم کرنا چاہیے تھا۔

انجمن تعلیم العربی کے دفتر گیا۔ وہاں مولانا عارف الدین صاحب سے ملا۔ ہماری انجمن ترقی و فروغِ کتب خانہ جات پاکستان کے لیے ایک لائبریری پلان مرتب کر رہی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں گزشتہ دنوں جناب پروفیسر خورشید صاحب سے بات کی تھی۔ وہ راقم الحروف کی درخواست پر میرے ہاں تشریف لائے تھے، محترم ڈاکٹر احسان رشید صاحب بھی میٹنگ میں تھے اور لائبریری سائنس کے دوسرے اساتذہ کرام بھی۔ میں نے اس پلان پر آج دستخط کر دیے ہیں، مگر شاید اس کام میں دیر ہو گئی ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب کا وزارت میں رہنا مشکوک ہے۔ وہ کابینہ حق میں شریک ہوئے تھے تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ کسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں اپنی آزاد پوزیشن میں شریکِ کابینہ ہوئے ہیں، لیکن جماعت کے پروگراموں میں اُن کا نام رُکنِ جماعت کی حیثیت سے آتا رہا اور وہ اپنی ذاتی حیثیت برقرار نہ رکھ سکے۔ میں نے مولانا عارف الدین صاحب سے کہا کہ پروفیسر خورشید با اصول انسان ہیں، اور غالباً وہ کابینہ میں نہیں رہیں گے۔

دفتر ہمدرد آیا۔ یہاں میں نے مجلسِ منتظمہ کی ایک ارجنٹ میٹنگ طلب کی، اور نونہال گرائپ واٹر کی قیمت پر تبادلِ خیال کیا اور اضافہ قیمت کو، کہ جو ناگزیر حالات کی وجہ سے لازمی ہوئی ہے، رُکوا دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ اضافہ قیمت رُکوا کر اضافۂ تیاری پر توجّہ کی جائے۔ کم مال تیار کر کے قیمت زیادہ کر دینا بڑا آسان نسخہ ہے۔ ایسی صورت میں محنت کم ہوتی ہے، منافع قائم رہتا ہے مگر خریدار زیرِ بار ہوتا ہے اور وہ کم محنت کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ میں زیادہ پروڈکشن اور کم منافع کو اہمیت دیتا ہوں اور اس رائے سے میرے رفقا بھی اتفاق رکھتے ہیں۔ چناں چہ مجھے ہمدرد کے مجلسِ اعلا کو اس موضوع پر مطمئن کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی اور اضافہ قیمت نہ کرنے کا اصول انھوں نے مان لیا ہے اور اب منتظمہ نے تیاری نونہال گرائپ واٹر تین گنی کر دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔

اِس میٹنگ میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا گیا۔ کارکنان کے عدم تعاون کو محبت سے تعاون میں بدلنے کی راہ تجویز کی۔ ہمدرد کا یہی اصول ہے۔

پاکستان طبی ایسوسی ایشن کے کارکنان ۵ بجے شام آئے۔ اُن سے دو گھنٹے مسائل طب و صحت پر تبادلِ خیال کیا۔ لاہور سے جناب حکیم عنایت اللہ نسیم صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ شریکِ گفت گو ہوئے۔

۸½ بجے رات عبدالستار صاحب کو دیکھنے گیا۔ اب ہفتے کے دن اُن کو ماہرِ امراضِ قلب جناب ڈاکٹر

شوکت سید صاحب کے ساتھ پھر دیکھنا ہے۔ اُن کی صحت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔

۲۰ر اپریل ۱۹۷۹ء، جُمعۃ المبارک

کل کا دن میں نے بڑی ذہنی تکلیف میں گزارا ہے مسلسل سفر نے، اور اس سفر میں شب و روز کام کرنے کی وجہ سے اِس بار میں نے تھکن کا احساس کیا ہے۔ اس قسم کی تھکن پر مَیں نے ہمیشہ قابو پایا ہے، لیکن کل گورنر ہاؤس میں جو واقعات پیش آئے اُن کی وجہ سے اس تکلیف میں اضافہ ہوا ہے۔ بارے میں نے ہمیشہ کی طرح اسے بھی برداشت کرلیا ہے۔ میں جانتا ہوں اور خوب تجربہ رکھتا ہوں کہ جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں اور تعمیرِ وطن اور خدمتِ خلق کے لیے میدانِ عمل میں مردانہ وار آتے ہیں اُن کو موانع سے واسطہ پڑتا ہے اور مشکلات اُن کی راہوں میں حائل ہوتی ہیں۔ مگر وہ اُن سے گھائل ہوکر بھی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی ساری زندگی ایسا ہی کیا ہے۔ میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ سرفراز ہوئے اور سربلند کہ جن کے کریڈٹ میں کوئی ایک کارنامہ بھی نہ تھا مگر درجنوں ایسی مثالوں سے میرے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی اور میں نے خدمت کی ایسی راہیں تلاش کیں جن پر چلنے کے لیے ہاتھی کا کلیجہ اور شیر کا دل چاہیے! پھر میری زندگی میں ایسا وقت بھی الحمد للہ آگیا ہے کہ صلے کی تمنا دل سے یکسر جاتی رہی اور تعریف و داد کی خواہشیں قطعاً مفقود ہوگئی ہیں۔ اب میں صلہ و داد سے بے نیاز ہوکر کام کرتا ہوں۔ بڑے مناصب بھی اب مجھے دل پسند نہیں ہیں۔ تاہم مناصب کا امتیاز اب بھی میرے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، بالخصوص اُس وقت کہ بڑا منصب کسی ایسے شخص کے پاس ہو کہ جو اس میدان میں جہلِ مرکب ہو۔

نواب سائل

بوالہوس کو دیکھیے بنتا ہے دعوے دارِ عشق
جس کو لوہے کا کلیجہ، شیر کا دل چاہیے

میں نے یہ جُملہ لکھا تو مجھے نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی یاد آگئے۔ واللہ کیا کلّہ جبڑا تھا۔ کیا تن و توش تھا اور کیا وقار تھا۔ ایسا شعر نواب سائل ہی کہہ سکتے تھے۔ آخر جانشینِ داغ دہلوی تھے۔ مجھے یہ فخر حاصل رہا ہے کہ میں اُن کے ہاں بے تکلف آتا جاتا تھا۔ لال دروازے میں ان کا مکان آج بھی موجود ہے۔ اب وہ میرے ماموں زاد بھائی اقبال احمد کا مسکن ہے۔ میں کبھی دہلی جاتا ہوں تو اقبال دعوت کرتے ہیں اور میں فوراً قبول کرلیتا ہوں کہ ان کا گھر کبھی ایک عظیم انسان کا مسکن تھا اور مرکز

شعر و سخن۔ آخر دنوں میں گر پڑے۔ ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ معذور ہو گئے۔ ایک رکشا رکھ لی تھی۔ جہاں جاتے اُس پر جاتے۔ ایک بار علیل ہو گئے اور معذور، مگر مَیں نے دیکھا کہ دہلی کالج کے ایک مشاعرے میں اسٹریچر پر پڑ کر پہنچ گئے اور مندرجہ بالا شعر پڑھا۔ انتقال کے وقت میں اُن کے سرہانے تھا۔ گرمیاں شدید تھیں۔ اعزہ کا انتظار تھا۔ جسمِ مُردہ کے چاروں طرف برف کی سِلیاں رکھی تھیں اور پنکھے چل رہے تھے۔ رات گئے دفنائے گئے۔ ان کے بعد دلی میں اس آن بان اور شان کا دوسرا انسان مجھے تو نظر نہ آیا!

"خبرنامہ ہمدرد" کی اشاعتِ خاص "روح افزا" شائع ہو گئی ہے۔ میں نے اس کو آج جستہ جستہ دیکھا ہے۔ اس کے بہت سے صفحات خود میرے لکھے ہوئے ہیں۔ کتابت اور تصحیح کی غلطیوں پر میں نے شعبۂ اشاعت کو ایک نوٹ لکھ دیا ہے۔

اطبائے غیر مستند کے لیے ایک تعلیمی نصاب تیار کرنے کے ذیل میں آج میں نے نکات کو آخری شکل دے دی ہے۔ اِس سلسلے میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے وائس چانسلر محترم ڈاکٹر ایس ایم۔ زمان صاحب اور اُن کے رفقا سے تبادلِ خیال کیا تھا۔ بارے اب میں نے یہ اسباق تیار کرنے اور کرانے کا کام ہاتھ میں لے لیا ہے۔ رموز و نکات آج مرتّب کر دیے ہیں۔

محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب جامعۂ پنجاب سے رٹائر ہو رہے ہیں۔ اُن کے احترام میں شعبۂ صحافت جامعۂ پنجاب ایک خصوصی کتاب شائع کر رہا ہے۔ جناب محترم مسکین حجازی صاحب نے ایک مضمون کی فرمائش کی تھی۔ میں نے آج یہ مضمون تیار کر دیا ہے اور برکاتی صاحب کو دے دیا ہے کہ ٹائپ کرا کے تاخیر کے بغیر روانہ کر دیں۔ یہ مضمون صحافت پر اور صحافی کی ذمہ داریوں پر ہے۔ آزادیِ صحافت کے مفہوم و معنی پر ہے۔

یہ تمام کام صبح ½۲ بجے سے ۶ بجے تک ختم کر لیے، اور ٹینس کھیلنے چلا گیا۔ آج ورزش کا دن ہے۔ موسم خاصا گرم ہے، مگر ٹینس کے دو سیٹ کافی ہوئے۔ ویسے صبح کو میں تین چار سیٹ تک چلا جاتا ہوں۔ گھر ½۷ بجے واپس آ گیا۔ غسل کر لیا اور پرتھ (آسٹریلیا) میں پاکستان اور ملائیشیا کے مابین جو ہاکی میچ ہو رہا ہے اسے دیکھا۔ پاکستان نے ملائیشیا کو ۹ گول سے ہرا دیا ہے۔ ہاکی میں پاکستان نے اوّلیت کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ کاش پاکستان بہ حیثیت پاکستان بھی اوّلیت کا فخر حاصل کر سکے۔ میری بڑی آرزو ہے، تمنا ہے اور

کوشش ہے۔

½8 بجے سے ½11 بجے تک میں نے مختلف اہم کاغذات کا مطالعہ کیا اور ضروری ہدایات تحریر کردی ہیں۔ غیر ملکی مختلف خطوط تھے، ان کے جوابات تیار کردیے ہیں۔ ہمدرد صحت کے لیے جو اداریہ پرسوں ہوائی جہاز میں لکھا تھا اس پر نظرِثانی کرکے شعبۂ ادارت کو بھجوا دیا ہے۔

کابینۂ حق

مسئلہ یہ درپیش رہا کہ کل جناب صدرِ مملکت نئی کابینۂ پاکستان سے حلف اٹھوا رہے ہیں۔ اس تقریب میں میری شرکت ضروری ہے یا نہیں۔ اس میں شرکت کے لیے عالی مرتبت جناب صدر گرامی قدر نے خود زبانی مجھ سے فرمایا تھا۔ بس یہی دعوت کانوں میں گونجی ہے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں کل صبح ½7 بجے اسلام آباد جاؤں گا۔ ٹکٹ منگوالیا ہے۔ عدم شرکت کا خیال صرف اس لیے ہے کہ میں نے کل مریضوں کو یہاں وقت دے دیا ہے اور ان کو تکلیف ہوگی۔ بارے میں نے صدرِ گرامی قدر کے ارشاد کی تعمیل کو مناسب خیال کیا ہے۔ میں اُن کا احترام کرتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں کہ وہ دل و جان سے پاکستان کو ایک مملکتِ اسلامیہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان سے محبت کی بنیاد یہی ہے۔ اور پھر وہ صاف گو ہیں، صاف دل ہیں۔ اُن کی یہ خوبیاں اُن سے قریب کرتی ہیں۔

کبھی تنہا بھی ....

نمازِ جمعہ سے قبل میں نے آرام کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دِل کو آزادی دے دیتا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو مجھے گہری نیند سُلادے اور اگر چاہے تو کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف کردے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب کوئی علمی اور ٹھوس کتاب ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی ہلکی چیز ہو۔ زمین پر میرے بستر کے سرہانے ہمہ قسم کی چیزیں رکھی رہتی ہیں۔ ان میں آج کل نسیم حجازی کا قیصر و کسریٰ بھی ہے اور میاں ایم۔ اسلم کا ایک ناول بھی ہے۔ کوثر چاندپوری کا شعلۂ سنگ اور وحیدہ نسیم کے کلام کا مجموعہ بھی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ پر الفاروق از شبلی بھی ہے اور آئن سٹائن پر مختلف کتابیں بھی ہیں جو میں آئن سٹائن پر ایک مضمون لکھنے کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ اس میں جامعۂ کراچی کی ایک کتاب بھی ہے جو اب اُس کی لائبریری کو واپس کررہا ہوں۔ ہاں عربی اتالیق بھی ہیں جن کا مطالعہ خاص طور پر اُس وقت کرتا ہوں جب مجھے کسی عرب ملک جانا ہو۔ واقعی بڑی شرم آتی ہے کہ جب میں عربی زبان بول نہیں سکتا۔ سمجھنے کی حد تک کوئی مشکل نہیں ہے، بولتے وقت زبان گنگ۔ سوچتا ہوں کہ کوئی عرب

سکرٹری ساتھ رکھوں اور اس طرح زبان سیکھنے کی کوشش کروں!

انٹرنیشنل سمپوزیم

نماز جمعہ کے بعد میں ۳ بجے اپنے ڈسک پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے یونیسکو سے متعلق فائل کو ہاتھ میں لیا۔ اب یہ طے کیا جا چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں انشاءاللہ تعالیٰ یونیسکو اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام پاکستان میں "نیو ریسرچز اِن بایولوجی اینڈ جینٹکس —— ایتھکل پروبلمز" موضوع پر ایک عالمی سمپوزیم ہو گا۔ اس میں مختلف ممالک سے پندرہ مندوبین اور پندرہ آبزرورز شریک ہوں گے اور پیرس اور نئی دہلی سے عملہ یونیسکو ہو گا اور عملہ ہمدرد ہو گا۔ میں نے یہ ذمّہ داری قبول کر لی ہے اور اب میں نے اس کی تیاری کا آج سے آغاز کر دیا ہے۔ اس پورے مسئلے پر غور کرنے کے لیے مجھے آج پانچ گھنٹے صَرف کرنے پڑے۔ اس کے بغیر احاطہ کامل ممکن نہ تھا۔ پھر میں نے اپنی سکرٹری مسز ڈسلوا کو ۸ بجے شب بُلایا اور ایک گھنٹہ اُن سے مشورہ کیا۔ طے یہی پایا ہے کہ سمپوزیم اسلام آباد میں ہونا چاہیے، گو کراچی میں ہمدرد کو زیادہ سہولت ہے، مگر ایک اچھا مذاکرہ اُن دنوں اسلام آباد میں ممکن ہو گا۔ میں نے حسابات وغیرہ کے خاکے سب آج تیار کر لیے ہیں۔ پروگرام میں مَیں نے خیبر پاس (پشاور) کو شریک کر لیا ہے۔ مذاکرے کے بعد میں کم از کم ایک دن کے لیے تمام لوگوں کو وہاں لے جاؤں گا۔ یومیہ جلسوں کے بارے میں یہ طے کیا کہ یہ صرف صبح کے اوقات میں ہوں گے، تاکہ شام سیر و آرام کے لیے خالی رکھی جا سکے۔ آخر میں یہ طے کیا ہے کہ مَیں کل اسلام آباد میں نیشنل کمیشن برائے یونیسکو سے تبادلِ خیال کروں گا اور پھر دہلی میں نمائندہ یونیسکو کو اسلام آباد بُلا کر پروگرام کو آخری شکل دے دی جائے گی۔

ایک جامع رپورٹ

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی ایک جامع رپورٹ شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ میں اپنی بے اندازہ مصروفیتوں کی وجہ سے سالِ گزشتہ اس کی تحریر کا وقت نہیں نکال سکا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو یہ کام سونپا، مگر وہ دوست اپنی مصروفیتوں اور علالتوں کی وجہ سے اب تک یہ کام نہیں کر سکے ہیں۔ آج میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ میرے دوست نے جہاں تک کام کر لیا ہے، اُس کے بعد سے میں خود یہ رپورٹ لکھوں گا۔ آج میں نے یہ ہدایات جاری کر دی ہیں۔ مجھے اس میں دو دن صَرف کرنے ہوں گے کم و بیش ایک سو صفحات تیار کروں گا۔ میرا دن صبح تین بجے سے رات نو بجے تک کا ہوتا ہے!

آج تمام دن فاقہ کیا۔ شب گزشتہ جو کھانا کھایا تھا وہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ میں آج تمام دن

آب لیموں پیتا رہا ہوں۔ رات کو ہلکا سا ناشتا کر لیا۔ ۱۰ بجے شب میں لیٹ گیا۔ اردو ڈائجسٹ میں ایک دل چسپ مضمون ہے اس کا مطالعہ کرتے کرتے سو گیا۔

میں نے شعبۂ اشاعت ہمدرد کو آج ہدایت دی ہے کہ ہمدرد کی سرگرمیوں وغیرہ کے بارے میں اخبارات میں جو چیزیں وغیرہ آتی ہیں ان کے تراشوں کو ہمدرد کے لیے ایک تاریخ کی حیثیت حاصل ہے۔ مناسب ہے کہ ان تراشوں کے بارے میں ایک پالیسی بنائی جائے اور لائبریری میں ان کی ترتیب و تنظیم کا اہتمام کیا جائے۔ ہمدرد لائبریری میں چار سو عنوانات پر جو تراشوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے اُس کو رفاہِ عام کے لیے مرتب کیا جا چکا ہے اور ہمدرد سے اہل فکر و قلم کے لیے علمی مدد کا سامان اب بڑے پیمانے پر کیا جا سکے گا۔

۱۲؍ اپریل ۱۹۷۹ء، ہفتہ

صبح تین بجے اُٹھ گیا۔ بڑی سخت ذہنی کش مکش ہے۔ ایک طرف اسلام آباد میں آج کی ذمّہ داری ہے اور دُوسری طرف مریضوں کا خیال ہے کہ وہ آج مجھ سے طبی مشورہ کرنے آئیں گے اور مَیں نہیں ہوں گا تو اُن کو بڑی ذہنی اور جسمانی تکلیف ہوگی۔ ایک بار مَیں نے فیصلہ کیا کہ اسلام آباد جانا ترک کر دینا چاہیے اور مریضوں کی خدمت کرنی چاہیے، مگر مسئلہ طب کا ہے جس کے لیے میں نے اپنی اُفتادِ طبع کے خلاف نئی ذمّہ داریاں قبول کی ہیں اور ان کو میں بہر قیمت پورا کرنا چاہتا ہوں اور اپنی ۳۱ سالہ جدّ و جہد کے باغِ طب کو نئے انداز سے گل زار بنا دینا چاہتا ہوں۔

نمازِ تہجّد سے فارغ ہو کر میں اپنے ڈیسک پر کام کر رہا تھا کہ ۵ بجے کے ذرا بعد لاہور سے حکیم عبدالباسط چشتی صاحب کا ٹیلے فون آیا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں علی الصباح کام کرتا ہوں اور ٹیلے فون پر مل جاتا ہوں۔ انھوں نے ہدایات طلب کیں۔ آج پاکستان طبی ایسوسی ایشن کا ایک وفد جناب حکیم علی احمد نیّر واسطی صاحب کی قیادت میں جنرل سوار خاں صاحب گورنر پنجاب سے مل رہا ہے۔ میں نے اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ طبیہ کالج لاہور کے حالات کو درست کرنے کے لیے گورنر صاحب کو مناسب تجاویز دی جائیں، تاکہ لاہور کے طبیہ کالج کو ایک بلند معیار کالج بنایا جا سکے۔ گزشتہ دنوں جناب گورنر صاحب نے اس کالج کی موجودہ امداد کو سہ گنا کر دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ صدرِ مملکت کے مشیر برائے طب سے مشورۂ مزید کے بعد امداد کو بڑھایا جائے گا۔ یہ شبہات ہیں کہ طبیہ کالج لاہور پر موجودہ کمیٹی کی پُوری توجہات نہیں ہیں۔ اس شبہ کو بہر حال دُور ہونا چاہیے اور

ضرورت ہو تو کالج کی منتظمہ میں مناسب ردّ و بدل کر کے اِس درس گاہِ طب کی حفاظت کی جائے۔
پونے سات بجے ہوائی میدان رَوانہ ہُوا۔ میری اہلیہ موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ میرے سفر پر رَوانہ ہوتے وقت میرے ساتھ ہوائی میدان تک آتی ہیں اور راستے میں وہ درود شریف پڑھتی رہتی ہیں اور مجھ پر پھونکتی رہتی ہیں۔ اُن کا یہ معمول ہے، میرے سفروں میں اضافوں نے ان کے معمول میں فرق نہیں آنے دیا ہے، مگر شاید وہ تھک جائیں! فی الحال میرا ارادہ تھکنے کا نہیں ہے!

وی۔ آئی۔ پی

ہوائی میدان پر محکمۂ تشریفات کے افسران نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ سوال کیا: کیا آپ وی۔ آئی۔ پی رُوم میں تشریف لے جانا پسند فرمائیں گے؟ میں نے کہا کہ میں نے وی۔ آئی۔ پی رُوم استعمال نہیں کیا ہے۔ میں اپنے معمول کے مطابق عام راستے سے آتا جاتا ہوں اور مجھے یہ پسند ہے۔ محکمۂ ہوائی میدان اپنے فرائض بھی ادا کرتا ہے، وہ میرے سامان کو بھی چیک کرتا ہے اور وہ میرا جھاڑا بھی لیتا ہے، مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میرا خطاب ستارۂ امتیاز، نیز میری موجودہ وزارتی پوزیشن مجھے امتیازی سلوک کا حق دار قرار دیتی ہے، مگر میں نے اِس امتیاز کو اپنے لیے پسند نہیں کیا ہے۔

تصاویر

میرے پاس کم و بیش پانچ ہزار فوٹو گرافس ہیں جن کی ترتیب کا کام اِن دنوں جاری ہے۔ میں نے کم و بیش ۲ ہزار فوٹو گرافس کو مرتب کر دیا ہے اور فائلوں میں لگا دیا ہے، مگر اب اس سے زیادہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں نے یہ کام اور سامان ہمدرد لائبریری کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ مجھے تصاویر دیتے رہتے ہیں اور میں اُن کے عنوانات دیتا رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شخصیات پر تصاویر کا اس سے بہتر مجموعہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔
اسلام آباد کے ہوائی میدان پر ½۹ بجے اُتر گیا۔ الحمدُ للہ۔ اور پھر ٹھیک ½۔۱ بجے پاکستان سکرٹری ایٹ میں اپنے دفتر پہنچ گیا۔ میں نے آج کے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دفتر میں بہت اہم چند کام کر لیے۔ لاہور، کوئٹہ، پشاور سے ٹیلی فون آئے۔ خود میں نے بھی ٹیلی فون کیے اور طب و اطبا کے بہت سے مسائل حل کر دیے۔ گزشتہ تین ماہ میں جو مسائل اُلجھے ہیں اُن کو سلجھانے کی طرف آج توجہ کا موقع ملا۔

مختلف الخیال افراد، نادان دوست اور دانا دشمن کے درمیان کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آج اس زنجیر آہنی کی ایک کڑی نکل گئی ہے۔ شاید اب راستہ کھل جائے گا۔

نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کے سکرٹری جنرل جناب رفیق صاحب سے دسمبر میں ہونے والے سیمنار بایولوجی کے بارے میں تبادلِ خیال کیا۔ اُن کی رائے ہے کہ کمیشن کے رُکن کی حیثیت سے یونیسکو کو آفیشل دعوتِ سیمنار دینے کا مجاز ہوں، تاہم میں سکرٹری ایجوکیشن کو لکھوں گا کہ وہ سرکاری سطح پر دعوت دے دیں۔

۲ بج کر ۴۰ منٹ پر بپابندیِ وقت میں گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ آج یہاں نئی کابینہ حق حلف اٹھائے گی۔ میں آج کراچی سے اسی تقریب میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ گزشتہ دنوں عالی مرتبت صدر گرامی قدر نے ازراہِ کرم ارشاد فرمایا تھا، کل کیبنٹ ڈویژن سے بھی کراچی یاددہانی کرائی گئی تھی اور آج بھی محترمی جناب کیبنٹ سکرٹری صاحب نے یاددہانی کرائی۔ تقریب بڑی سادہ مگر بڑی اچھی تھی۔ میں نے اطمینان محسوس کیا۔ نئی کابینہ میں زیادہ تر حضرات کا تعلق عساکرِ پاکستان سے ہے اور ان میں اکثریت میری دوست ہے۔

عالی مرتبت جناب صدر گرامی قدر سے علاحدگی میں مَیں نے بات کی۔ انھوں نے مجھے اطمینان دلا دیا ہے کہ اب صحت کا محکمہ اُن کے اپنے پاس ہے، اس لیے مجھے کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو گا۔ میں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میں یقیناً آزادی کے ساتھ خدمت کر سکوں گا۔

محترم جسٹس حمودالرحمٰن صاحب بھی ایڈوائزر مقرر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے جناب محترم بروہی صاحب کی جگہ لی ہے۔ ویسے قلم دانِ وزارتِ قانون محترم جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب کو ملا ہے۔ جناب صدر گرامی قدر، جناب جسٹس حمودالرحمٰن صاحب اور میں جب آج یک جا ہوئے تو جناب جسٹس صاحب نے فرمایا کہ: "حکیم صاحب نے مجھے تقاریر کے لیے ہموار کر لیا ہے۔ انھوں نے اپنی وہ تقریر جنابِ صدر کی جناب میں پیش کی جو وہ شامِ ہمدرد کراچی میں کر چکے تھے۔

آج ایک گروپ فوٹو ہوا ہے۔ اس کے بعد جنابِ صدر نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا۔ میں نے دیکھا کہ اُن میں حد درجہ خود اعتمادی تھی۔ وہ ہر موضوع پر پوری طرح حاوی تھے۔ پریس کانفرنس میں ہم سب لوگ بھی بٹھائے گئے تھے۔ جنابِ صدر نے آج ہدایت فرمائی کہ وزرا کو چاہیے کہ وہ اہلِ صحافت کو اپنی اپنی وزارتوں کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ پریس کانفرنس

بھی کیا کریں تاکہ اہلِ وطن کو حالات کا علم ہوتا رہے۔ آج کی پریس کانفرنس کا یہ اہم نکتہ تھا۔

ہوائی جہاز کی فرصت سے میں نے آج پورا فائدہ اُٹھایا۔ اخبارات کے اہم تراشے کہ جو میں لائبریری سے روزانہ طلب کرتا ہوں وہ پندرہ دن سے جمع ہو گئے تھے اور مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج کراچی سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے کراچی کے سفر میں میں نے اُن کا مطالعہ کر لیا اور ان پر نکات تحریر کر دیے تاکہ میں جو نوٹ لکھنا چاہتا ہوں اُس میں سہولت ہو۔

۲۲ر اپریل ۱۹۷۹ء، اتوار

شبِ گزشتہ ذہن اس درجہ تازہ نہ تھا کہ میں ڈاک دیکھ سکتا۔ صبح حسبِ معمول تین بجے اُٹھ گیا اور معمولاتِ نیم شب پورے کر کے چار بجے اپنی میز پر آ گیا۔ تمام ڈاک دیکھ لی۔ اس سال کے شروع کا "ہمدرد مڈیکس" چھپ کر آ گیا ہے۔ اس بار اس کا زیادہ تر کام مُعاون مُدیرہ خانم دہلوا اور اُن کی معاون مس زاہدہ نے کیا ہے۔ میں نے اِس اشوع کو اطمینان سے دیکھا۔ میرے دوست ڈاکٹر سامی خلف حمارنہ صاحب نے بڑا اچھا مضمون لکھا ہے۔ ڈاکٹر حمارنہ اُردنی ہیں، مگر گزشتہ ۲۱-۲۲ سال سے واشنگٹن، امریکا میں رہتے ہیں۔ دُنیا کے مشہور ادارے سمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کے شعبۂ سائنس سے وابستہ رہے ہیں۔ اب ریٹائر ہو کر بھی وہ وہاں مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ تاریخِ طبِ عربی پر اُن کو اچھا عبور حاصل ہے۔ البیرونی کی کتاب الصیدنہ کے میرے ترجمۂ انگریزی پر کمنٹری انھوں نے لکھی تھی۔ میں اب اس کتاب پر نظرِ ثانی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دیکھیے کب فرصت میسّر آتی ہے۔ "ہمدرد مڈیکس" نے طب کا مُعاملہ عالمی سطح پر پیش کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم نے طب کی آواز مغرب اور امریکا وغیرہ ممالک میں اُس وقت بلند کی کہ جب لوگ طب کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ مگر میں نے اس جریدے کا عنوان ہی "وائس اوف ایسٹرن مڈیسن" رکھا تھا۔ میں نے اپنی تحریرات سے نیز اپنی تقاریر و خطابات سے نیز عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) پر کم و بیش ۱۷-۱۸ سال مسلسل زور ڈال کر بالآخر طب کا مقام تسلیم کرا لیا ہے۔ اب جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ روس ہو یا برطانیہ، مغرب ہو یا امریکا ہر جگہ طب پر تحقیقی کام جاری ہیں تو مجھے بڑا ہی اطمینان ہوتا ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق طب کے فطری اصولِ علاج کی طرف لوگوں کو مائل کر دیا ہے جس سے راہِ فرار اختیار کر کے پوری نئی طب اُس روش پر چل پڑی کہ جو فطرت سے متضاد ہے اور اب ساری دُنیا اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے، مگر میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ میں طب کے لیے پاکستان میں راہ ہموار نہ کر سکا۔ ہمارے ہاں گورے کا شاگرد آج بھی یہی کہا کرتا ہے کہ طب ایک فرسودہ نظامِ علاج ہے۔ گزشتہ

دنوں پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل نے جو روش اختیار کی ہے وہ انتہائی غیر اخلاقی (اخلاقِ طب کے منافی) اور غیر انسانی ہے اور سائنس کے بالکل خلاف۔ پاکستان میں اس طبِ مغربی کے حامل سب سے زیادہ اس پر معترض ہیں کہ طب کو اسلامی کیوں کہا جائے۔ دُوسرا زور اُن کا اس پر ہے کہ طبِ مغربی کے یہ آقا طبِ مشرقی کے طلبہ کو درس نہیں دیں گے۔ شاید ہی ان کو یہ اندازہ ہو کہ ان اقدامات ِغیر شرعی سے انھوں نے پاکستان کے لوگوں کی نگاہ میں خود کو کس قدر گرا لیا ہے۔ کاؤنسل کے اندازِ فکر سے یہ بات اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثابت ہو گئی ہے کہ پاکستان کے ڈاکٹر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اُن میں فنی تعصب اب معراج کو پہنچ گیا ہے۔ وہ میدانِ طب میں اپنی شکست کو اپنے غلط اقدامات سے تسلیم کرتے ہیں۔ ساری دنیا جس طب کو سائنس کہتی ہے اور اس پر تحقیقات کرتی ہے پاکستان کے ڈاکٹر اس کو فرسودہ نظامِ طب کا نام دیتے ہیں۔ آج سارا عالم جڑی بوٹیوں میں تلاشِ شفا کر رہا ہے اور اِدھر پاکستان کا ڈاکٹر جڑی بوٹیوں سے متنفر ہے اور اس کو جڑی بوٹیوں پر تحقیقاتِ طبی سے بیر ہے۔ میری رائے میں اس سے زیادہ غیر سائنسی حرکت کوئی دُوسری نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہاں وزارتِ صحت میں کوئی ایک وزیرِ صحت ایسا نہ آیا کہ جو ذرا بھی صحتِ فکر رکھتا ہو۔ میرا ذاتی تجربہ گزشتہ ۳۱ سال کا یہی ہے اور اب تازہ ترین تجربہ تلخ ترین ہے

صبح ۵ بجے میں تیار ہو کر مطب روانہ ہو گیا۔ مطب میں بکثرت مریض موجود ہیں۔ میں نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے مریضوں کی خدمت شروع کر دی اور سلسلۂ مطب شام کے چھے بجے تک جاری رہا۔ تیرہ گھنٹے مسلسل مطب کرنے کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ میرے ساتھی بدل گئے۔ صبح سے ایک بجے تک طبیب اور طبیبائیں کام کر کے چلی گئی ہیں اور اس کے بعد شام تک دوسرا گروپ کام کرتا رہا۔ مطب میں میری اعانت ۱۰۔۱۱ اہلِ فن کرتے ہیں۔ تین سو سے زیادہ مریضوں کو ان کے امراض کے چنگل سے نکالنے کی جدوجہد ایک ایسی خدمت ہے کہ ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ضمیر کا یہ اطمینان گزشتہ ۳۱ سال سے ہو رہا ہے اور شاید اس وجہ سے زندہ ہوں۔

بڑوس میں ایک پیارے دوست کے ہاں مسلم آباد گیا۔ اُن کا مسئلہ خاصا نازک ہو گیا ہے۔ بارے میں نے اُن کا مسئلہ حل کرنے کی سعی کی ہے۔ نمازِ مغرب ادا کر کے ان کے ہاں گیا تھا۔ ایک گھنٹہ لگا۔ گھر واپس آیا۔ آج اتوار ہے، بچے جمع تھے۔ اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ اِس اثنا میں ٹیلی وژن پر کمال احمد رضوی صاحب کا پروگرام "ڈرتا ہوں آئینے سے" شروع ہوا۔ میں نے اس کو اطمینان سے دیکھا۔ اچھا اندازِ فکر ہے۔ گزشتہ اتوار کو بھی یہ پروگرام دیکھا تھا۔ کمال صاحب جب ملیں گے مبارک باد دُوں گا۔

رات ۱۰ بجے مَیں لیٹ گیا۔ اخبارات پر ایک نگاہ ڈالی۔ پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ذہن اب مزید کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

۲۳ اپریل ۱۹۷۹ء، پیر

صبح ۳ بجے بیدار ہو گیا اور تیار ہو کر بارگاہِ ایزدی میں سر بہ سجود ہو گیا۔ اگر ساری عمر سر بہ سجود رہوں تو حقِ تشکّر و امتنان ادا نہ ہو۔ اللہ سبحانہٗ و تعالےٰ نے مجھے خدمتِ خلق کے لیے چُنا ہے اور مجھے کام و خدمت کا موقع عطا فرمایا ہے۔ مَیں کس طرح اس کرم و رحم کا شکریہ ادا کروں!

۴ بجے اپنی میز پر آ گیا۔ راولپنڈی سے اخبارات لایا ہوں۔ دو دن کے اخبارات یہاں تھے۔ ان سب کو دیکھا اور ان پر نشانات لگا دیے اور لائبریری ہمدرد کے تراشوں کے شعبے (کلپنگ سیکشن) میں اخبارات بھجوا دیے۔ مَیں گزشتہ ۲۰۔۲۱ سال سے یہ کام کر رہا ہوں۔ ہمدرد لائبریری میں میں نے کم و بیش چار سو موضوعات پر اخباراتِ وطن سے تراشے جمع کیے ہیں۔ اب یہ شعبہ ہمدرد لائبریری کا ایسا شعبہ ہے کہ شاید ملک میں جس کی مثال نہ ہو۔

لائبریری کے بارے میں ایک کتابچہ میں نے مرتب کرا لیا ہے۔ اس پر نظرِ ثانی بھی کر لی ہے۔ اب یہ چھپنے جا رہا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمدرد لائبریری میں کیا کیا موجود ہے اور اہلِ علم کی یہاں سے کیا خدمت کی جا سکتی ہے۔ یہ کتابچہ جلد ہی شائع کر دیا جائے گا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۹ اپریل کی میری اس ڈائری کے صفحات کی فوٹو کاپی جناب گورنر صاحب سندھ کی خدمت میں بھجوا دی جائے۔ خط لکھ کر اور ہدایت دے کر میں اسلام آباد چلا گیا تھا۔ میرے معاون مسعود احمد برکاتی صاحب نے یہ خط روک لیا۔ اُن کی رائے ہے کہ اس سے جناب گورنر صاحب کا مزاج برہم ہو سکتا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ اگر اسلامی دَور کے گورنر ہیں، اور اُن کو اسلامی شعار کا پاس و لحاظ ہے تو اُن کو میرے حقیقی تاثرات پڑھ کر خوش ہونا چاہیے۔ تنقید اگر پُرخلوص ہو اور اس نکتے پر مرکوز ہو کہ اصلاحِ حال ہو جائے تو اس سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں نے برکاتی صاحب سے کہا کہ میں نے اپریل ۱۹۷۹ء کے شب و روز چھاپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فرمائیے کیا ۱۹ کی ڈائری آپ اس میں سے حذف کریں گے! ظاہر ہے کہ ڈائری کے تاثرات کو روکنا یا گورنر صاحب کی خاطر اس کو حذف کرنا دیانت داری تو نہ ہوگا۔ عتاب زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں مدینۃ الحکمت جو شہرِ علم آباد کرنے کا آرزومند ہوں گورنر صاحب اس کے لیے رعایتی قیمت پر زمین دینے میں رکاوٹ کھڑی کر دیں گے۔ اوّل تو وہ شرعاً اور اخلاقاً ایسا نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو دُنیا تنگ نہیں ہے۔ خدمت کا ایک راستہ

بند ہوگا انشاء اللہ دس دروازے فوراً کھل جائیں گے۔ میری ساری زندگی ایسے تجرباتِ شدید سے عبارت ہے!

آج صبح ۴ بجے سے ۸½ بجے تک بہت سے کام ختم کرلیے ہیں۔

مجلسِ منتظمۂ ہمدرد

۱۰ بجے مجلسِ منتظمہ ہمدرد کے ہفتہ وار جلسے کا آغاز ہوگیا۔ آج میں نے پروڈکشن پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ مجھے آج کیمسٹ، نگراں پروڈکشن، انجنیئر وغیرہ کو اس مجلس میں بُلانا پڑا اور اُن کو ذرا تاکید کے ساتھ ہدایات دینی پڑیں۔ بارے میں نے نونہال گرائپ واٹر، ہمدرد گھُٹی، کارمینا اور شعالین کے بارے میں آج حتمی ہدایات دے دی ہیں اور زبردست تنبیہات کردی ہیں۔ رُوح افزا کے مسائل بھی سامنے آئے۔ میں نے اس باب میں رہنما اصول دے دیے ہیں اور ہدایات کردی ہیں کہ روح افزا کی تیاری میں کوئی امر مانع نہ آنے پائے اور روح افزا کی فراہمی میں کوئی کوتاہی نہ ہو اور لوگ تکلیف نہ اٹھائیں۔

نونہال گرائپ واٹر کی تشہیر کا پلان میں نے گزشتہ کئی ماہ میں مرتب کردیا ہے۔ میرے دوست اور رفیق چودھری عبدالغفور صاحب (ایڈ آرٹس) نے بڑی محنت سے پورا کیمپین مرتب کردیا ہے۔ آج میں نے مجلسِ منتظمہ کے جلسے میں اس کو حتمی طور پر منظور کرلیا ہے۔ ریڈیو پروگرام ہنوز میری مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ میں ایک "لوری" اس انداز میں چاہتا ہوں کہ ہر ماں اپنے بچے کی تربیت و پرداخت کے وقت اپنے ذہن میں یہ بات رکھے کہ وہ کل کے پاکستان کے لیے ایک فرزندِ جواں کو تیار کررہی ہے۔ جذبۂ خدمتِ وطن اُس میں بیدار رہو۔ میں نے اس "لوری" پر مزید توجہ کرنے کی ہدایت دے دی ہے۔

زہراوی

"اسلام اینڈ موڈرن ورلڈ"، ڈھاکا، بنگلادیش کے مدیر جناب شمس صاحب آئے تھے۔ اُن سے آدھ گھنٹہ تبادلِ خیال کیا۔ وہ "ہمدرد اسلامیکس" سے متاثر ہیں۔ تعاون کرنا چاہتے ہیں اور تعاون چاہتے ہیں۔ میں نے ان کے اطمینان کا سامان کردیا ہے۔

یورک شائر (انگلستان) کے پروفیسر........ ملنے آئے تھے۔ وہ ایک ماہر سرجن ہیں۔ ہمدرد لائبریری میں انھوں نے کافی وقت گزارا۔ ان کو ابوالقاسم الزہراوی پر حوالہ جات کی ضرورت تھی۔ وہ ان کو مل گئے ہیں۔ اور وہ مطمئن ہیں۔ ابوالقاسم الزہراوی تاریخ طبِ اسلامی کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے وقت کے ماہر ترین جراح (سرجن) تھے۔ ان کی کتاب التصریف ان کے فن کی بہترین

عکاس ہے۔ اِس کتاب کا اُردو ترجمہ میرے رفیقِ کار حکیم نثار احمد علوی صاحب نے کیا تھا۔ اب وِیلکم فاؤنڈیشن نے اس کا انگریزی ترجمہ شرح و بسط کے ساتھ انگلستان سے شائع کیا ہے۔

میں نے اِس سلسلے میں اپنے عزیز دوست اور پاکستان کے ماہر سرجن ڈاکٹر الیف۔ یُو۔ بقائی صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے لیکچرز اس پر تیار کریں کہ ابوالقاسم الزہراوی کی سرجری کیا تھی اور آج سرجری کیا ہے۔ زہراوی نے جو آلاتِ جراحت ایجاد کیے وہ کیا تھے اور آج ان کی شکل کیا ہے۔ ڈاکٹر بقائی صاحب نے میری درخواست پر گزشتہ ماہ "فارمیسی اینڈ میڈیسن تھرُو دی ایجز" سیمنار کے دَوران اِس موضوع پر ایک لیکچر دیا ہے اِس دُو روزہ سیمنار کے دوران ایک نمائش ہمدرد نے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے مرتب کی تھی۔ پاکستان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اقدام تھا۔ اس موضوع پر یہ کام درحقیقت تاریخ ساز کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر بقائی صاحب نے یہ بات بڑے فخر سے بیان کی کہ ابوالقاسم الزہراوی نے جو آپریشن کیے اور جو تکنیک اختیار کی اور جو آلاتِ سرجری ایجاد کیے وہ یقیناً آج بھی ماڈرن ہیں اور اُس دَور کی جراحی میں اور آج کی جراحی میں کوئی فرق نہیں ہے!

میرے دوست ڈاکٹر سرجن الیف۔ یو۔ بقائی علم و فن کی یہ خدمت کر رہے ہیں، مگر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن اور اس کے بزعمِ خود صالح جنرل سکرٹری صاحب انھی بقائی کے خلاف محاذ قائم کرتے ہیں۔ ان پر الزام ایک یہ ہے کہ انھوں نے ہمدرد کے زیرِ اہتمام سیمنار میں تقریر کی۔ یہ وہی میڈیکل ایسوسی ایشن ہے جس نے چین کے اکیوپنکچر کو اس لیے تسلیم کیا تھا کہ امریکا کے "نیوز ویک" نے اُس کی تائید کی تھی۔ یہ ہے اس ایسوسی ایشن کا مرتبۂ علم!

کوریئر — نباتات اِشوع

شام کے چھ بجے تک دفتر میں مصروف رہا۔ آج ایک بڑا اہم کام ختم کیا ہے جس کے بعد ایک اطمینان کی کیفیت محسوس ہوئی۔ یُونیسکو کے ماہنامے "کوریئر" کے مدیران کی ایک میٹنگ سالِ گزشتہ پیرس میں ہوئی تھی۔ میں نے وہاں جو مشورے دیے تھے، اُن میں ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ "کوریئر" کا ایک خاص اِشوع "نباتات" ہونا چاہیے۔ قائم مقام مُدیرۂ اعلا مادام اولگا روڈیل نے اس اہم کام کی ذمہ داری پورے خلوص سے قبول کرلی ہے۔ اس کا کافی کام میرے ذمّے بھی ہوا ہے۔ میں نے خود اس اشاعتِ خاص کے لیے شیخ الرئیس ابنِ سینا کے "رسالۂ ادویۂ قلبیہ" کو قدیم و جدید معلومات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ اپنے دوست ڈاکٹر سامی خلف حامرنہ صاحب سے مشورہ کیا ہے۔ ایک مضمون نباتاتِ چین پر مرتب کرلیا ہے اور ٹائیٹل کے لیے ڈزائن بھی پاکستانی مصوّر نے تیار کر کے دیا ہے۔ اب تک جو کام ہوگیا ہے وہ سب ہوائی ڈاک سے پیرس روانہ کردیا ہے۔ یہ کام ختم ہوگیا ہے۔ یُونیسکو کوریئر ۲۰ زبانوں میں چھپتا ہے۔

"پیامی" اس کا اُردو ایڈیشن ہے جس کی اہلِ وطن نے کوئی داد نہ دی حالانکہ میں نے بڑی فریاد کی!
پاکستان ہی کے اہلِ فضل وکمال کی متفقہ رائے یہ ہے کہ "پیامی" اُردو زبان کا واحد جریدہ ہے کہ جو اس قدر احتیاط و نفاست اور نُدرت و جامعیت کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی پاکستان میں پیامی کا حال یہ ہے کہ اس کے ہزار خریدار بھی آج تک پیدا نہ ہوئے۔ میں مایوس نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا کہ صاحبانِ نظر اعتراف کریں گے کہ پیامی نے ثروتِ اُردو میں اہم اضافہ کیا ہے۔

چھے بجے تک مسلسل کام کرتے ہوئے مجھے ۱۵ گھنٹے ہو گئے تھے۔ میں گھر آیا۔ غسل کیا۔ نمازِ مغرب ادا کی اور پھر آج کی ڈاک کو دیکھا کہ جو میں دفتر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ رات نو بجے تک کام ختم ہو گیا۔ میں نے کھانا نوشِ جان کیا۔ نمازِ عشا ادا کر کے بستر میں دراز ہو گیا۔ اخبارات دیکھے۔ انڈیا آفس لائبریری سے ایک فہرست آئی ہے۔ آج اس کو دیکھا۔ میں اس تلاش میں ہوں کہ دَورِ مغلیہ میں نظامِ طب ہندستان میں کیا تھا اور اس دَور کے ہسپتالوں میں فارما کو پیا کیا تھا۔

۲۴ اپریل ۱۹۷۹ء، منگل

اندازِ شب و روز

ہمدرد کی رفاہی خدمات کا دائرہ جس سرعت کے ساتھ وسیع ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ جو نئی نئی ذمہ داریاں عائد ہو رہی ہیں اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مخلص اور ایثار پسند کارکنان کی ضرورت مزید ہے۔ میں آج صبح ۴ بجے جب اپنی میز پر آ کر بیٹھا تو مجھے اس فکر نے گھیر لیا اور میں صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا اور مسئلے کے حل پر غور و فکر کرتا رہا۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ متعدد میدان ہائے عمل میں پیش رفت کر رہا ہوں، میرے فکر و عمل کے میدان وسعت اختیار کرتے جا رہے ہیں اور ان کا ساتھ دینے کے لیے کارکنان کم ہیں۔ میں نے اب ہمدرد کے ایگزیکٹوز پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے معاونین پیدا کریں اور ایک اور مضبوط ٹیم بنانے کا فریضہ انجام دیں تاکہ کل ہمدرد کو جب میں نہیں ہوں گا، ایسے لوگ میسّر رہیں کہ جو ہمدرد کی خدمات کو دَوام بخشنے کے اہل ہوں۔ میرے پیشِ نظر اب "مدینۃ الحکمت" ہے۔ میں اگر اپنی عمر اسّی سال فرض کر لوں تو اب تک میں ۳/۴ عمر گزار چکا ہوں اور ۱/۴ عمر کہ جو باقی ہے وہ "مدینۃ الحکمت" کی تکمیل کے لیے اُس وقت کافی ہو سکتی ہے کہ میں اپنی تمام توجہات کو اس پر مرکوز کر دوں۔ اس کے لیے میرے موجودہ رفقائے کار کو میری مصروفیتوں کو کم کرنا ہو گا۔ میرا کام سنبھالنا ہو گا اور مجھے بہت سے کاموں سے سُبک بار کرنا ہو گا۔ گزشتہ بُدھ کو جب میں اسلام آباد سے کراچی ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا تو میں نے دورانِ سفر ہمدرد صحت کے لیے سوال و جواب کے صفحات

لکھے۔ پھر جب گزشتہ ہفتے کے دن اسی طرح اسلام آباد سے کراچی کا سفر جہاز کر رہا تھا تو اخبارات کے تراشے نکال کر اُن کا مطالعہ کر رہا تھا اور ان پر نکات لکھ رہا تھا جناب حمید۔ ڈی۔ حبیب رفیقِ سفر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ ہوائی جہاز میں بھی۔ کام کرتے ہیں! میں نے اُن سے کہا کہ یہ وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے اور میں اس کو بھی ضائع نہیں کرتا ہوں۔ مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا اس قسم کا کام اب میرے رفقا کو سنبھال لینا چاہیے۔ مدینۃ الحکمت کے لیے مَیں صرف اللہ پر بھروسا کرنا چاہتا ہوں اور پھر خود پر۔ اس لیے مجھے اپنے شب و روز کے انداز کو بدلنا ہوگا۔ میں اِن دنوں کاروبارِ ہمدرد پر معمول سے زیادہ متوجّہ ہوں۔ مَیں کاروبار میں توسیع نہ صرف اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو ایک ہزار سے زیادہ کارکُن ہیں اُن کی خوش حالی کا سامان کروں، بلکہ مدینۃ الحکمت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے رکھ دُوں۔ توسیعِ کاروبار سے مدینۃ الحکمت عالمِ وجود میں آئے گا اور یہ پاکستان کا انشاء اللہ تعالےٰ مرکزِ علم و حکمت بن کر رہے گا۔

ریاضی کنگرس

جسم کو ورزش کی ضرورت تھی۔ ٹینس کے دو سیٹ بڑے مفید ثابت ہوئے۔

۹½ بجے دفترِ ہمدرد آ گیا۔ جناب پروفیسر رحمان فاروقی صاحب سے تبادلِ خیال کیا۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں نے "کنگرس عالمی علومِ ریاضی" کا انتظام پاکستان میں کیا تھا پروفیسر فاروقی کو میں نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں کنگرس کی تنظیم کی تربیت ان کو دے دُوں۔ رحمٰن فاروقی صاحب نے بڑے دل سے کام کیا تھا۔ یہ وہ کنگرس عالمی ہے کہ جس کو شروع میں بہ نگاہِ تحقیر یہاں دیکھا گیا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ اُس وقت کے صدرِ مملکت محترم چودھری فضل الٰہی صاحب کو منع کر دیا گیا کہ وہ اس کا افتتاح نہ کریں۔ بے چارے صدرِ مملکت مجھ سے وعدہ کر چکے تھے مگر حکمِ حاکم سے مجبور رہے۔ کراچی میں آ گئے تھے مگر رسمِ افتتاح اُن کی قسمت میں نہ تھی! پھر لوگوں نے دیکھا کہ میں نے اس اوّلین کنگرس میں دُنیائے ریاضی سے عالمی شہرت کی شخصیات کو پاکستان میں جمع کر دیا اور کنگرس کی شہرت ساری دنیا میں ہوئی۔ ان ہی دِنوں قائدِ اعظم یُونی ورسٹی کی وائس چانسلر مس کنیز یوسف صاحبہ شاید اسٹاکہام میں تھیں۔ وہاں بھی ریڈیو پر نیز اخبارات میں پاکستان کی اس کنگرس کا شہرہ تھا۔

اس کنگرس میں جو مقالات پیش ہوئے تھے وہ عالمی انداز کے تھے اور ریاضی کے میدان میں پیش رفت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب یہ کتابی شکل میں تیار ہو رہے ہیں۔ رحمان فاروقی صاحب اس کام کو کر رہے ہیں۔ میں ہر پندرہ دن بعد جائزہ لیتا ہوں۔ توقع ہے کہ وسطِ جون تک یہ ایک ہزار

صفحات کی ایک بہترین کتاب تیار ہو جائے گی۔ رحمان فاروقی صاحب آج ہدایات لینے آئے تھے۔ وہ انٹرنیشنل اور "پان اسلامک ایسوسی ایشن اوف میتھے میٹکس" کے بارے میں بھی ہدایات لے گئے ہیں۔ میں نے اس کی صدارت کے لیے انجینئرنگ یونی ورسٹی کراچی کے وائس چانسلر جناب محترم عبدالرحمان اخوند صاحب کا نامِ نامی تجویز کیا تھا۔ وہ انھوں نے منظور فرمالیا ہے۔ میں نے ۱۵ مئی ۷۹ء کے بعد کا وقت دیا ہے تاکہ اب ایسوسی ایشن بنالی جائے اور تمام ممالکِ اسلامیہ کی رکنیت کا سامان کیا جائے۔ رحمان فاروقی صاحب کو ضروری رہنمائی دے دی ہے۔

انجمن فروغِ کتب خانہ جات

مولانا عارف الدین صاحب تشریف لائے تھے۔ سوسائٹی فار دی پروموشن اینڈ امپرومنٹ اوف لائبریریز کے لیے مولانا روحِ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بڑی خاموشی مگر تن دہی کے ساتھ پاکستان میں لائبریری تحریک کا فریضہ انجام دیا ہے۔ میں اس باب میں پوری طرح ان کا ساتھ دیتا رہا ہوں۔ ہم نے کئی نیشنل کانفرنسیں، ورکشاپ وغیرہ کیے ہیں۔ ہماری متعدد مطبوعات ہیں، اور ہم نے پاکستان کے لیے ایک لائبریری پلان بھی تیار کیا تھا جو گزشتہ دنوں میں نے جنابِ محترم صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کیا تھا اور انھوں نے غور کے لیے وزارتِ تعلیم کو دے دیا ہے۔ آج مولانا عارف الدین چاہتے تھے کہ چیئرمین پلاننگ کی حیثیت چوں کہ جناب صدرِ مملکت کو حاصل ہے اس لیے ۶ مئی کو جب وہ اہلِ کراچی سے ملاقات کریں، سوسائٹی کا ایک وفد اُن سے ملاقات کرے اور کراچی نیز پورے ملک کے لیے ایک پلان کی تیاری اور عمل پر توجہ کرے۔ میں نے اس کی منظوری دے دی ہے اور ایک خط تیار کرا دیا ہے۔

الطّبُ الاسلامی

محترم ڈاکٹر حسین محمد جعفری صاحب تشریف لائے تھے۔ اُن سے متعدد مسائل پر تبادلِ خیال ہوا۔ میں نے اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ میرے مقالے "الطّب الاسلامی" کو از سرِ نو مرتب کر دیں اور اُس میں جو زوائد ہیں وہ نکال دیں اور نیا میٹیریل جو میں نے تیار کر کے ان کو دے دیا ہے اُسے شریک کر دیں۔ یہ دو ماہ کا کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری مدد کا وعدہ کر لیا ہے۔ یہ مقالہ میں نے ورلڈ اوف اسلام فیسٹول (لندن) کے موقع پر پیش کیا تھا اور اس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر سید حسین نصر صاحب (ایران) نے شیراز میں ایک عالمی طبّی کانفرنس کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا اور میری مدد چاہی تھی۔

یہ کانفرنس ۷, مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ یہ بندۂ عاجز انتخاب لڑ رہا تھا اور زبردستی اس عذاب سیاست میں مبتلا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں پرنسٹن یونی ورسٹی (امریکا) گیا تھا اور عالمی شہرت کے اسکالر پروفیسر فلپ حتی صاحب کی مزاج پُرسی کے لیے اُن کے گھر گیا تھا تو وہ اپنی علالت کے باوجود میرا مقالہ الطب الاسلامی پڑھ چکے تھے اور جگہ جگہ نشان لگا چکے تھے۔ انھوں نے اس کے بارے میں مجھے مفید مشورے دیے تھے اور مقالے پر اپنا ایک نوٹ بھی لکھ دیا تھا جسے میں نے اطمینان و مسرت کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ پروفیسر فلپ حتی صاحب سے میرے ذاتی مراسم تھے۔ جب بھی امریکا گیا اُن کے ہاں ایک دن کے لیے ضرور گیا۔ آخری بار جب ۱۹۷۷ء میں گیا تو وہ علیل تھے اور خود دروازہ کھولنے بیساکھی کے سہارے آئے تھے۔ اُس وقت ان کی اہلیہ اُن کو داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ وہ موٹر کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئی تھیں۔ غالباً یہ موٹر وہی تھی جس پر ۱۹۷۴ء میں انھوں نے مجھے پرنسٹن کی سیر کرائی تھی۔

مَیں سالِ گزشتہ قاہرہ میں تھا تو وہاں پروفیسر گورونر نے یہ تاثر دیا تھا کہ فلپ حتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے کراچی آتے ہی اُن کی بیٹی اور اُن کے داماد پروفیسر بیلی وائنڈر کو ایک خط لکھا اور شکایت کی کہ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا۔ اُن کا جواب آیا تھا کہ حتی بقیدِ حیات ہیں، مگر ہسپتال میں داخل ہیں۔

اس کے بعد گزشتہ جنوری میں پروفیسر بیلی وائنڈر نے اطلاع دی کہ پروفیسر فلپ حتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اتوار ۲۴, دسمبر ۱۹۷۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ پاکستان میں اُن کی رحلت کی کوئی خبر نہ چھپی۔ ٹائم میگزین نے چھاپا اور پھر میں نے امریکی قونصلیت سے ۲۵, دسمبر ۱۹۷۸ء کا نیویارک ٹائمز حاصل کیا جس میں پوری خبر تھی اور تفصیلات۔ اس کی مدد سے ہمدرد اسلامیکس میں مَیں نے خبر شائع کی۔ فلپ حتی نے بلاشبہ اسلامیات پر قابلِ فکر کام کیا ہے۔ اُن کی عظمت کو سلام!

گھر آ کر میں نے آج ایک گھنٹہ آرام کیا۔ پھر ۴ بجے سے رات ۸ بجے تک اپنی میز پر متفرق کام کرتا رہا ۸½ بجے ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر محمد قمر صاحب کے مطب گیا۔ دائیں آنکھ جو ۱۹۷۷ء میں ایک "حادثہ بیداری" کا شکار ہوئی تھی اور واشنگٹن میں اتفاق سے صورتِ حال کا علم ہو گیا تھا۔ میں معائنۂ چشم کے لیے گیا تھا' ماہرین نے کہا: "ڈاکٹر سعید آپ کی تو بینائی ضائع ہو رہی ہے، قرنیہ میں سوراخ ہے اور ریٹنا الگ ہو رہا ہے۔ مَیں نے دو ماہرین کی اس رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اُن کی رائے تھی کہ فوراً اور سیدھے ہسپتال جائیں ورنہ آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل پڑے گا، مگر میں نے اللہ پر بھروسا کر کے پہلے تین دن نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیں اور پھر ایک دن داخلِ ہسپتال ہو کر آنکھ کا آپریشن کرایا اور دوسرے دن صبح ہوائی جہاز میں واشنگٹن سے نیویارک آ گیا اور رات ۷ بجے نیویارک سے روانہ ہو کر ۹, اکتوبر کی صبح ۵ بجے

میڈرڈ (اسپین) آگیا تھا۔

اسی آنکھ میں ذراسی تبدیلی محسوس کی۔ ڈاکٹر قمر صاحب سے مشورہ کیا۔ اُن کی رائے ہے کہ آپ کی نیند میں کمی ہے، اس لیے دُھند ہے۔ آرام کیجیے۔

آرام کیسے اور کب کروں!

رات ۹ بجے سندھ کلب گیا۔ محترمی ڈاکٹر ایف یُو بقائی صاحب نے یاد فرمایا تھا۔ میری حاضری وہاں رسمی تھی۔ میں ۱۰ بجے گھر واپس آگیا۔ ڈاکٹر بقائی صاحب کراچی میں ایک میڈیکل کالج قائم کرنے کا عزم کر چکے ہیں۔ میں بھی اُن کی ہمت بندھاتا رہا ہوں۔ ان دنوں وہ آخری مراحل میں کام کر رہے ہیں۔ انشاءاللہ یہ پُرجوش انسان یہ خدمت کر گزرے گا اور بہت سے صالح ڈاکٹر کہ جو اُن پر الزامات تراشتے ہیں، شرمندہ ہوں گے۔

۲۵ را پریل ۱۹۷۹ء، بُدھ

سفید عذاب

صبح ۴ بجے بیدار ہوا۔ ۵ بجے اپنی میز پر آگیا۔ آج میں نے "سفید عذاب" کے عنوان سے ہمدرد صحت کے لیے ایک اداریہ سپردِ قلم کر لیا ہے۔ ارادہ تھا کہ آج ۴۔۵ شذرات تیار کر دوں گا، لیکن قلم جب چلا تو سفید عذاب آٹھ صفحات میں پھیل گیا۔ یہ اداریہ میں نے خشک دودھ کی درآمد پر لکھا ہے جس کے بارے میں میری حتمی رائے یہ ہے کہ اس دودھ کی درآمد کسی طرح بھی پاکستان کے حق میں مفید نہیں ہے اور ہر چیز کی طرح اِس میدان میں بھی پاکستان کو اُلٹا سیدھا مال فراہم کیا جا رہا ہے اور صحت و زندگی کے لیے خطرات کا سامان کیا جا رہا ہے۔ میں نے ہدایت کی ہے کہ ٹائپ کرا کے مضمون نظرثانی کے لیے مجھے دے دیں اور پہلے اسے "مشرق" میں اشاعت کے لیے بھجوا دیں۔

جماعتِ اسلامی کے ایک بزرگ نے ایران سے آکر ایک بیان میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ بہشتِ زہرہ فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ یہاں وہ لوگ دفن ہیں کہ جنھوں نے ایک ڈکٹیٹر سے نجات حاصل کرنے اور ایران میں انقلابِ اسلامی برپا کرنے کے لیے جانیں قربان کی ہیں۔ اس جدّ وجہد میں مرنے والوں کی تعداد اسّی ہزار ہے۔ مجھے خیال آیا کہ پاکستان میں انقلابِ اسلامی برپا کرنے کے لیے جن لوگوں اور جماعتوں نے ساتھ دیا تھا اور صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی ڈکٹیٹری سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کی تھی اُس وقت کیا ہوا تھا۔ محمد ایوب خاں نے حالات کا صحیح جائزہ لیا اور ملک کو کشت و خون کے عذاب سے بچانے کے لیے وہ فوراً مستعفی ہو گئے اور اُن کے

اس فیصلے کی وجہ سے پاکستان میں ایک جان بھی ضائع نہیں ہوئی۔ آج کے حالات میں غور کرنا چاہیے کہ ایران میں ایک ڈکٹیٹر کو ہٹانے کے لیے اسّی ہزار جانیں قربان ہوئیں اور ایوب خاں نے ایک بھی جان ضائع نہیں ہونے دی۔ اس فرق کو محسوس کرنا چاہیے، اور ان لوگوں کو بھی اپنے کردار پر غور کرنا چاہیے جنھوں نے ایوب خاں جیسے معتدل مزاج انسان کو ڈکٹیٹر قرار دیا تھا اور اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، مگر اس کے بعد بھی ہم نے دیکھا کہ ملک کے حالات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی! اصل بات یہ ہے کہ جب تک ہم ٹھوس بنیادوں پر کردار کی اصلاح و تربیت کا کام ہاتھ میں نہ لیں گے اوپری تبدیلیاں کارگر نہ ہوں گی۔

آج کے اخبارات نے کراچی زُو کے بارے میں ایک خبر چھاپی ہے کہ دو نوجوان اپنی ایئرگن لے کر چڑیا گھر میں گئے۔ یہاں نہایت قیمتی پلیکان کو نشانہ بنا دیا کہ جو انڈے سے رہا تھا۔ اس قسم کے واقعات کراچی چڑیا گھر میں عرصے سے رُونما ہو رہے تھے اور بالآخر آج شکاری پکڑے گئے۔ پلیکان تو خیر اپنی جان سے گئے اور کراچی کا چڑیا گھر دو اچھے پرندوں سے محروم ہو گیا، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں نظامِ اخلاق اور تعلیم و تربیت کا کس قدر شدید فقدان ہے!

آج نو بجے سے ½ ۱ بجے تک دفتر ہمدرد میں مختلف مسائل پر تبادلِ خیال کرتا رہا۔ مختلف شعبوں کے سربراہوں کو ضروری ہدایات دیتا رہا۔ اسلام آباد میں اپنے دفتر میں بھی ہدایات دیتا رہا۔ اسلام آباد سے محترم جناب پروفیسر لئیق احمد صاحب نے رابطہ قائم کیا کہ وہ ہفتے کو ایک اہم پروگرام طب پر رکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیلے وژن کی خود پیش کش ہے کہ میں بھی اس پروگرام میں شرکت کروں۔ ہر چند کہ یہ بڑا شارٹ نوٹس ہے مگر مجھے لئیق احمد صاحب عزیز ہیں اور اُن کی بات کی قدر ہے میں نے نیم وعدہ کر لیا کہ میں ہفتے کی شام کو ۴ بجے کے جہاز سے پہنچ کر ۹ بجے رات کے جہاز سے کراچی واپس آجاؤں گا، لیکن میں نے اس صورتِ حال پر غور کیا تو مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس پروگرام میں میرے بجائے جناب حکیم علی احمد نیّر واسطی صاحب کو شرکت کرنی چاہیے۔ میں محترم لئیق صاحب سے کل درخواست کروں گا کہ وہ حکیم نیّر واسطی صاحب کو بُلا لیں اور حکیم صاحب سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ دعوت قبول فرمالیں۔

چھاپے خانے سے آج کتابچہ "آوازِ اخلاق" تیار ہو کر آگیا ہے۔ یہ منشور ہے پاکستان میں تحریکِ اخلاق کا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں اس منشور کو دستی اپنے مریضوں کو دُوں گا۔ انشاء اللہ تعالےٰ اس ہفتے کے دن سے اس کی تقسیم شروع ہو جائے گی اور دیکھوں گا کہ اس ذیل میں تعاون کی شکل کیا ہوتی

ہے۔ میں اپنے ذہن میں خاکہ تیار کرچکا ہوں۔ توقع ہے کہ رمضان المبارک میں یہ تحریکِ اخلاق پوری رفتار کے ساتھ شروع کردوں گا اور آوازِ اخلاق کو ہر کان تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ پاکستان میں اس وقت ہر سیاست کو ترک کر دینے کی ضرورت ہے اور سیاست دانوں کو صرف افرادِ ملت کے کردار و اخلاق کو بلند کرنے کی جدّوجہد کرنی چاہیے۔

"ہمدرد اسلامیکس" پانچویں اشاعت کے لیے آج مضامین پر تبادلِ خیال ہوا۔ محترم پروفیسر بزمی انصاری تشریف لائے تھے۔ پروفیسر فاطمی صاحب نے اپنے نوٹ لکھ دیے تھے جن کو میں نے اطمینان سے دیکھا تھا۔ آج تمام پہلوؤں سے غور کرکے میں نے مضامین حوالے کر دیے۔ ۱۲ ربیع الاوّل کو جناب صدرِ مملکت نے انقلابِ اسلامی کے ذیل میں جو اعلانات کیے تھے میں نے ہمدرد اسلامیکس میں ان کو شریک کیا ہے۔ اعلانات کے ساتھ جو حوالہ جات اور ضمیمے ہیں گو وہ بہت طویل اور ۴۵ صفحات پر مشتمل ہیں اور رسالے میں گنجائش نہیں ہے، تاہم میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ان سب کو اگلی کے بجائے اِسی اشاعت میں شریک کرنا چاہیے۔ ایک مضمون ایسا رہ گیا ہے کہ جس میں پروفیسر حسین محمد جعفری کے مشورے کی ضرورت ہے۔ میں نے پروفیسر بزمی انصاری سے درخواست کی ہے کہ وہ ان سے مشورہ کرلیں۔

"ہمدرد اسلامیکس" کی اشاعت ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے واضح طور پر اس مقصد کے لیے ہوئی ہے کہ پاکستان سے اسلامیات پر کوئی بھی قابلِ ذکر جرنل شائع نہیں ہوتا، اور یہ کہ علماء و فضلائے پاکستان کہ جو صرف اردو میں لکھتے ہیں ان کے افکار کا علم باہر کی دنیا کو نہیں ہوتا۔ میرا حقیقی منشا تو یہ ہے کہ میں ہمدرد اسلامیکس کا اُردو ایڈیشن بھی شائع کروں اور اس سے انگریزی سے اُردو میں تراجم شائع کروں تاکہ پاکستان کے علما اُن افکارِ مغرب سے آگاہ اور واقف ہوسکیں کہ جو صرف انگریزی میں شائع ہوتے ہیں، مگر مَیں اب تک اُردو ایڈیشن کی ہمت نہیں کرسکا ہوں۔

رُوٹس: الیکس ہیلے کی عالمی شہرت کی کتاب "روٹس" کو امریکی ٹیلی وژن نے فلمایا ہے۔ امریکی بلیکس کہاں سے آئے اور کس طرح آئے، پہلا کالا امریکی افریقہ میں کہاں سے آیا تھا، اس پر الیکس نے تحقیق کی ہے اور بڑی دل چسپ کتاب تیار کی ہے جس کے دنیا کی بڑی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اس فلم نے اس کتاب کا بہترین تعارف کرایا ہے۔ امریکی سنٹر کراچی میں آج سے یہ فلم دکھانی شروع کی گئی ہے۔ ۱۲ گھنٹے کی لمبی فلم ہے۔ آج ۶½ بجے سے ۱۰½ بجے تک کا پروگرام تھا۔ کل اور پرسوں اسی طرح جاری رہے گی۔ میں نے آج آدھا پروگرام دیکھا۔ بہت دل چسپ!

گھر آیا تو محترم پروفیسر منظور احمد آچکے تھے۔ حکیم محمد یٰسین، محترم ڈاکٹر منظور اور میں تینوں روانہ ہوئے اور جناب ڈاکٹر ایف۔ یو۔ بقائی صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ آج ارادہ کیا تھا کہ کوئی آرام کی بات کی جائے۔ رات ۱۲ بجے تک ہم چاروں اور نجمی صاحب اِطمینان سے باتیں کرتے رہے۔ ہم نے ملک کی موجودہ صورتِ حال پر غور کیا اور ملک کی سالمیت کے لیے دُعائیں کیں اور باتیں ختم ہوئیں۔ میری رائے یہی ہے کہ سیاست ہماری مدد نہیں کرے گی، ہمیں سیاست کو ترک کر کے افرادِ ملّت کی تعمیرِ ذہنی اور پاکستان کی ترقی پر توجّہ کرنی چاہیے۔ میں مرکز اور صوبوں میں شوریٰ قائم کرنے کو مناسب سمجھتا ہوں۔ اِن مجالسِ شوریٰ میں ملک سے تمام رہنماؤں کو غیر سیاسی اصولوں پر شریکِ حکومت کرنا چاہیے اور سیاست کو ممنوع قرار دینا چاہیے اور شوریٰ میں ایسے کسی ایک فرد کو شریک نہ کیا جائے کہ جو اسلام پر یقین نہ رکھتا ہو اور نہ کسی ایسے شخص کو شریک کیا جائے کہ جو کسی بھی اعتبار سے پایۂ دیانت سے گرا ہوا ہو۔ پاکستان میں جو حالات ہیں وہ سیاسی توڑ جوڑ کے، کہ جو گزشتہ ۳۲ سال سے جاری ہے متحمل نہیں ہو سکتے۔ فوج کو اپنی بارکوں میں چلا جانا چاہیے اور شوریٰ میں اُس کی نمائندگی کو قرار واقعی مقام دینا چاہیے۔ میں نے فوج کو بھی ہمیشہ یہی رائے دی ہے۔

جناب جنرل سی۔ کے۔ حسن صاحب سکرٹری ہیلتھ سے کل میں نے بات کی تھی، آج دن کو تار بھی دے دیا ہے کہ میں عالمی صحت مجلس (ورلڈ ہیلتھ اسمبلی) جینوا میں شرکت کروں گا۔ آج دسمبر ۱۹۷۹ء میں ہونے والے سمپوزیم بایولوجی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے اور نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کو بھی تار دے دیا ہے کہ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل صاحب کو رسمی دعوت نامہ بھجوا دیا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پروگرام کو حتمی شکل دینے کے لیے نئی دہلی سے یونیسکو کے ڈائریکٹر صاحب کو تبادلِ خیال کے لیے ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء کو دعوت دینی چاہیے۔ وہ اسلام آباد آئیں گے۔

۲۶ اپریل ۱۹۷۹ء، جُمعرات

آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ نماز فجر کے بعد مجھے دوبارہ لیٹ جانا پڑا۔ ۷½ بجے جب اِطمینان ہوا تو اُٹھ گیا۔ تیار ہو کر اخبارات پر ایک نظر ڈالی۔ آج ٹینس کھیلنے کا دن ہے جس کا میں ورزش کی خاطر انتظار کرتا ہوں، مگر آج مصلحت کے خلاف تھا۔ ڈاک جو باقی تھی اُسے دیکھ کر میں نے دفتر بھجوا دیا۔ ۹½ بجے میں خود دفتر پہنچ گیا۔

اخبار ڈان میں شعبۂ مراسلات میں اہمیت کے ساتھ ایک نامعقول خط ایک ڈاکٹر ایس۔

اے۔ سمیع شاہ کا چھپا ہے۔ موضوع ہے طبِ اسلامی۔ واہیات تباہیاں ہیں۔ پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ وہی ڈاکٹر صاحب ہیں جن کے بارے میں اب تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ ہولی فیملی ہسپتال سے کیوں الگ ہوئے اور خسرہ کے زمانے میں انھوں نے جو اشتہارات تقسیم کرائے تھے اُن پر اخلاقِ طبی نے کیا گرفت کی۔ میں نے جواب کے لیے نوٹ تیار کر لیے ہیں۔

میں نے آج حتماً فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے اپریل کے شب و روز کتابی شکل میں شائع کر دوں گا۔ اس کے لیے آج ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ میٹریل جمع کر لیا ہے۔ میرے اپنے لکھے ہوئے کوئی ایک سو چالیس صفحات ہو گئے ہیں۔ ابھی ۲۵۔۔۳۰ صفحات اور ہو جائیں گے۔

طبیعت بدستور مکدر رہی۔ ۲ بجے گھر آگیا اور پھر لیٹ گیا۔ ۴ بجے اُٹھ کر میز پر بیٹھ گیا۔ آج میں نے اپنے سرکاری فائلوں کو ہاتھ میں لے لیا ہے، اور ضروری نوٹ تیار کر لیے ہیں۔ ۶ بجے خانم ڈسلوا آگئیں۔ ان کے ساتھ امریکن سنٹر گیا۔ وہاں جو امریکی کالوں کے بارے میں تاریخی فلم رُوٹس دکھائی جا رہی ہے اُس سے مجھے دل چسپی ہے۔ آج میں نے رات ½۱۰ بجے تک اُسے دیکھا۔ یہاں آج سندھ کے چیف جسٹس جناب عبدالقادر شیخ صاحب بھی آئے تھے۔ پاکستان کاؤنسل اوف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کراچی کے ڈاکٹر یوسف احمد اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالحمید چھوٹانی صاحب بھی تھے۔ اُن سے تبادلِ خیال کیا۔ اُن کا تعلق سوشل سروسز کاؤنسل سے ہے۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ وہ بچّوں کے بارے میں کوئی ایسا پروگرام مرتب فرمائیں جس کی وجہ سے ماؤں میں اپنے بچّوں کو صحت مند رکھنے کا رُجحان پیدا ہو۔ ایسے پروگرام کراچی، سکھر اور حیدر آباد میں کیے جا سکیں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک تجویز تیار کریں گے۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۹ء، جمعۃ المبارک

صبح ۴ بجے بیدار ہو گیا۔ ۵ بجے تیار ہو کر اپنی میز پر آگیا اور ۷ بجے تک میں نے گیارہ صفحات پر مشتمل ایک خط بنام مُدیر ڈان تیار کر دیا ہے۔ میں نے اُردو میں لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ آج تیار کر کے حکیم محمد لٹیین صاحب ڈان کے مُدیرِ محترم کو جلد بھجوا دیں گے۔ ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

ورزش کے لیے ٹینس کھیلنے چلا گیا۔ ایک اچھا سیٹ مل گیا۔ اس سے زیادہ ورزش مناسب نہیں تھی۔ مشہور ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر محمد قمر صاحب آگئے۔ میں اُن کا منتظر تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے کھیل کا آغاز کریں میں نے ان سے اپنی آنکھ کی تکلیف بیان کی جس کی وجہ سے میں پرسوں سے خاصا پریشان ہوں۔ پرسوں شب جب میں امریکن سنٹر میں تھا بائیں آنکھ میں مَیں نے وہی چمکیاں

(فلیشنز) محسوس کیں کہ جو ۱۹۷۷ء میں میری دائیں آنکھ میں مدینہ منورہ سے مکۃ المکرمہ رات سفر کے دوران محسوس کی تھیں اور جو بالآخر بڑی خطرناک ثابت ہوئی تھیں۔ امریکا میں جب میں نے اپنی اُس تکلیف کو دکھایا تو اُس وقت نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ بس ذراسی تاخیر اور ہو جاتی تو آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل پڑتا۔ اُس کا فوری آپریشن ہوا تھا۔ اب بالکل تکلیف اُسی انداز سے بائیں آنکھ میں پرسوں شب سے ہے اور میں پریشان ہوں۔ ڈاکٹر قمر صاحب بھی خاصی تشویش میں پڑ گئے ہیں۔ پھر وہ میرے ساتھ گھر آئے۔ محترمی ڈاکٹر مختار احمد صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا، مگر آج جمعہ ہے، تعطیل ہے۔ وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں۔ تلاش جاری ہے۔

ڈاکٹر قمر صاحب تشریف لے گئے۔ حضرت احسان دانش صاحب تشریف لائے۔ اُن سے آدھ گھنٹہ بڑی دل چسپ باتیں ہوئیں۔ اکیڈمی اوف لیٹرز کے بارے میں اُن سے تفصیلات معلوم کیں۔ جو حالات علم میں آئے ان سے اطمینان نہیں ہوا۔ ایک اچھے کام کو بعض لوگ بگاڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عجب حال ہے، تعمیر کے ساتھ ہی تخریب کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حضرت احسان دانش صاحب کے ساتھ اُن کے بڑے صاحبزادے بھی آئے تھے جو طبیب ہیں۔ میں نے اُن کو کل ۱۱ بجے بُلایا ہے۔

ایک بجے ڈاکٹر قمر صاحب پھر تشریف لائے۔ ڈاکٹر مختار صاحب مل گئے ہیں اور اپنے مطب پہنچ گئے ہیں۔ ہم بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مختار صاحب نے بڑے اطمینان سے آنکھ کا معائنہ کر لیا ہے۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ بہ ظاہر آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں ہے، تاہم اِحتیاط کا تقاضا ہے کہ نماز میں سجدہ طویل نہ ہو اور تکیے پر ہو تو بہتر ہے۔ دوبارہ چند دن بعد مُعائنہ ضروری ہے۔ میری بے اِطمینانی اپنی جگہ باقی ہے۔ آنکھ میں پُتلی پھیلانے کی دوا ڈالی گئی ہے۔ اب آج کا دن کام کا نہ رہا۔ حال آں کہ آج مجھے کئی چیزیں لکھنی تھیں۔

شام کے ۵ بجے اُٹھ کر اپنی میز پر آگیا۔ دوا کا اثر باقی ہے۔ دیکھنے میں ہنوز فرق ہے، تاہم میں نے کام شروع کر دیا۔ اللہ مالک ہے۔ ہمدرد نونہال کے بچوں کے طبی سوالات کے ۴ جوابات لکھ دیے ہیں۔ ہمدرد صحت کے لیے دو مضامین درست کر دیے ہیں اور اگلے ہمدرد صحت کے لیے مضامین کا انتخاب کر لیا ہے۔ فائل درست کر لیے ہیں اور اتوار کو سفر کے لیے بیگ تیار کر لیا ہے۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۹ء، ہفتہ

طب ـــ عالمی پیش رفت

صبح ساڑھے تین بجے بیدار ہو گیا اور معمولاتِ "نیم شب" سے فارغ ہو کر اپنی میز پر آگیا۔ اب

جو گھڑی دیکھی تو ساڑھے تین بجے تھے! میں ڈھائی بجے اُٹھ گیا تھا! ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں نے اس حادثے کی بڑی قدر کی اور وہ فائل نکال لیا کہ جو عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کے ایسٹرن میڈیٹرینین ریجن، اسکندریہ، سے آیا تھا۔ یہ خط جناب ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ تابا صاحب کی جانب سے ہے اور اس میں انھوں نے پاکستان میں طب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے بارے میں لکھا ہے۔ گزشتہ ایک ماہ میں اس پر توجہ نہیں کر سکا تھا۔ بارے آج میں نے اس کام کی تکمیل کر دی ہے اور یہ آج انشاء اللہ تعالےٰ اسکندریہ روانہ کر دیا جائے گا۔ عالمی ادارۂ صحت نے اس ریجن میں جو اقدامات کیے ہیں ایسے ہی اقدامات ایک سال قبل بلکہ اس سے بھی پہلے ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں کر چکا ہے۔ سالِ گزشتہ اُس نے ایک مشاورتی میٹنگ مرکز (جینوا) میں بُلائی تھی، مگر اس میں پاکستان نے شرکت نہیں کی تھی اور اس لیے شرکت نہیں کی تھی کہ پاکستان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے وزارتِ صحت سے استفسار بھی کیا تھا مگر وہ لاجواب رہے اور جب میں نے یہی سوال جنابِ محترم صدرِ مملکت کی موجودگی میں وزیرِ صحت اور سکرٹری صحت سے کیا تو انھوں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر جب سکرٹری ہیلتھ صاحب نے اپنے بغچے سے وہ رپورٹ نکالی کہ جو مرکز کی اس میٹنگ سے متعلق تھی اور بڑے فخر سے اُسے پیش کیا تو میں نے سوال کیا کہ یہ بتلائیے کہ اس رپورٹ میں پاکستان کا ذکر کہاں ہے؟ پاکستان یہاں کیوں غیر حاضر ہے۔ سکرٹری ہیلتھ کو یہ اندازہ نہ تھا کہ میں وہ رپورٹ بار بار پڑھ چکا تھا۔ بالآخر جناب صدر نے بھی استفسار فرمایا کہ پاکستان کیوں غیر حاضر ہے؟ آخر میں نے ہی جواب دیا: اس لیے جناب والا کہ ہم طب کے مخالف ہیں۔ دعوت نامہ آیا تھا مگر وزارتِ صحت نے اسے دبا لیا اور کسی طبیب کو نہیں بھیجا۔

طب کے ساتھ پاکستان میں یہ سلوک ہرگز پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے۔ تیسویں ورلڈ ہیلتھ اسمبلی میں جب طب کے بارے میں ریزولیوشن پیش ہوا تو تمام دنیا کے نمائندگان نے اس کی تائید کی اور صرف ایک ملک نے مخالفت کی، اور وہ پاکستان تھا! اس صورتِ حال پر عالمی ادارۂ صحت نے پاکستان اور اس ریجن کو صریحاً نظر انداز کیا۔ وہ عربوں کے اندازِ فکر سے بھی واقف تھا۔ اس لیے اُس نے اپنی توجہات دُوسری طرف منعطف کیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیقی پیش رفت دوسرے علاقوں میں خوب ہوئی اور پاکستان اس میدان میں بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ ہندوستان نے اِس صورتِ حال سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کا اندازِ فکر یہ ہے کہ انڈیا کے پنج سالہ منصوبے میں دیسی طبوں میں تحقیق کے لیے ساٹھ کروڑ رُپے رکھے گئے ہیں اور موجودہ دیسی طبی درس گاہوں کی ترقی کے لیے ہر ایک کو کم از کم ۲۵ لاکھ رُپے دیے گئے ہیں۔

پاکستان میں وزارتِ صحت، پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن اور پاکستان میڈیکل ڈینٹل کاؤنسل کے اس منفی رویے نے کہ طب فرسودہ اور بے سود ہے نہ صرف یہ کہ پاکستان میں مسئلۂ صحت کو اُلجھایا ہے،

بلکہ ترقیِ طب کی راہ میں ایسی رکاوٹیں ڈالی ہیں کہ پاکستان میں دواؤں کے میدان میں نہ خود اعتمادی پیدا ہوسکی اور نہ خود کفالتی۔ اور اس سے بڑھ کر ایک بڑا صریحی اور الم ناک نقصان یہ ہوا ہے کہ پاکستان میں کوئی اساسی تحقیقِ طبی (بے سک طبی ریسرچ) نہ ہوسکی اور نہ اس کی طرح ڈالی جاسکی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستان ۳۲ سال میں تحقیقاتِ طبی کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا اور دنیائے طب میں پاکستان کا کنٹری بیوشن صفرِ محض ہے۔ ایسا اِس حال میں ہوا ہے کہ سب جانتے ہیں اور اس کی نفی کی جُرات کسی میں نہیں کہ پاکستان میں اگر کوئی اساسی ریسرچ ہوسکتی ہے تو اُس کے لیے میدان صرف اور صرف طب ہے۔ پاکستان میں ریسرچ کے نام و عنوان پر جو چیز ہو رہی ہے اُس کا مرتبہ محض یہ ہے کہ پاکستان کے محققین طب مغربی کے تجربات و تحقیقات کی تائید میں اپنی توانائیاں صَرف کرتے رہے ہیں اور اس تحقیق اور ریسرچ کا کوئی فائدہ پاکستان کو نہیں پہنچا ہے اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے۔ بنیادی ریسرچ تو صرف طب میں ہوسکتی ہے اور اس کے لیے حکیم، ڈاکٹر اور سائنس داں کو متحد الفکر اور متحد العمل ہونا ہوگا۔ اس اتحادِ ثلاثہ کے بغیر بھی کوئی بنیادی ریسرچ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنے نقطۂ فکر کی اور اس حقیقت کی وضاحت گزشتہ ۱۷-۱۸ سال سے مسلسل کر رہا ہوں۔ بایں ہمہ اصرار یہ ہے کہ کام اس انداز سے نہ ہو جس کے معنی بجز اس کے دُوسرے نہیں کہ پاکستان میں ریسرچ کی داغ بیل صحیح خطوط پر نہ پڑ سکے۔

جناب صدرِ گرامی قدر کے ارشادات کی روشنی میں من جملہ اور کمیٹیوں کی ایک ریسرچ کمیٹی قائم ہونی تھی۔ اس کے ساتھ اب تک جو مذاق ہوتا رہا ہے وہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔ میں نے تمام حالات کا جائزہ لے کر جو مشورے دیے ہیں اُن کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اُس کے بالکل برعکس اقدامات ہوئے، اور پھر ایک دوسری کمیٹی بنا دی گئی جس کے ارکان کا انتخاب ایک بار پھر غلط ہوا۔ میں نے پھر گرفت کی اور غلطیوں کی نشان دہی کی اور ایک بار پھر واضح کر کے بات کو پیش کر دیا اور ریکارڈ کر دیا کہ اس مُعاملے میں کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہر غلطی نہ طب کے مفاد میں ہوگی اور نہ پاکستان کے حق میں۔ اِس واضح رہنمائی کے باوجود یہ کوشش ہوئی کہ اس لنگڑی لُولی ریسرچ کمیٹی کا ایک جلسہ بہرحال بُلا لیا جائے تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نکل آئے کہ اب تو کمیٹی بن چکی ہے اور اب کسی تبدیلی کی ضرورت نہ گنجائش۔ اب میرا یہ تاثر یہ ہے کہ یہ ایک سازش ہے اور بڑی افسوسناک اور شرم ناک سازش۔ میں نے ٹیلے فون پر ہدایت کی ہے کہ پیر کو کہ میں اسلام آباد میں ہوں گا، مجھے یہ فائل درکار ہے۔ میں طب اور طبی ریسرچ کے بارے میں اِس سازش کو ناکام بنانے کا عزم کر چکا ہوں۔

صبح ۶ بجے مطب میں آگیا۔ نیند کی کمی کی وجہ سے میرے دماغ کی قوتیں زیادہ بیدار رہیں۔ تین بجے

تک میں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ اتنا کام مَیں ۵ بجے تک کرتا ہوں۔ ۲۶۳ مریضوں کی خدمت کر کے میں مطمئن اور میرے رفقا مسرور۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور میں دفترِ ہمدرد میں ۳½ بجے بیٹھ گیا۔ یہاں میرے لیے کام جمع تھا۔ میں نے پانچ بجے تک اپنا سب کام ختم کر لیا۔

ارادہ تھا کہ آج جیم خانے میں ٹینس کا میچ دیکھنے جاؤں گا، مگر عین وقت پر مسعود احمد برکاتی صاحب نے بتایا کہ شب و روز کی کتابت کے لیے کاتب تیار ہے اور مسودہ درکار ہے۔ میرا اپریل کا روزنامچہ تیار ہے، مگر جب اشاعت مقصود ہے تو پھر نظرِ ثانی ضروری۔ اور افکارِ سیاسی کو حذف کرنا لازمی کہ برداشت کی تاب ہے نہ مجال! بس میں گھر آگیا اور غسل کر کے نمازِ عصر ادا کر اپنی میز پر بیٹھ گیا اور رات ۹ بجے تک میں نے ۳۰ صفحات پر نظرِ ثانی کر لی۔ اس کام میں تقریباً چار گھنٹے لگے۔ میرے اب تک ۱۵۰ صفحات لکھے گئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ کتاب کوئی ۲۰۰ صفحات کی ہو جائے گی۔

برادرِ عزیز ڈاکٹر الیاس آئے۔ اُن کو میری آنکھ کی تکلیف کے بارے میں مجھ سے زیادہ تشویش ہے۔ اُن کو ۱۹۷۷ء کی میری تکلیف کا صحیح اندازہ ہے۔ میں نے ان کو واشنگٹن سے ۱۹۷۷ء میں جو نوٹ لکھا تھا اس کا یہاں درج کر دینا کم دل چسپ نہ ہوگا:

برادرِ عزیز من

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ! میں واشنگٹن میں اپنے بہترین فرائض ادا کر کے ہفتے کی صبح نیویارک آگیا تھا۔ یہاں ڈاکٹر برکات احمد صاحب پروسٹیٹ کے اپریشن میں غلطی ہو جانے کے بعد علیل پڑے ہیں۔ پیشاب پر قابو جاتا رہا ہے۔ اُن کو ذہنی الجھن ہے اور صحیح ہے۔ ان کی عیادت ضروری تھی۔ اس لیے میں نے صبح واشنگٹن سے نیویارک آنے کا فیصلہ کر لیا اور تمام دن برکات صاحب کے ساتھ رہا اور کل رات کو ساڑھے سات بجے اُڑ کر آج صبح سات بجے میڈرڈ آگیا ہوں۔

واشنگٹن میں ۳ر اکتوبر کی صبح میری آنکھ کا معائنہ تھا۔ اس کا انتظام ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹ نے کر دیا تھا۔ ڈاکٹر براؤن نے بڑا تفصیلی مُعائنہ کیا۔ اُن کی رائے یہ قرار پائی:

۱۔ آپ کی آنکھ کے قرنیہ میں سُوراخ ہو گیا ہے۔

۲۔ ریٹینا کریک ہے۔

۳۔ ریٹینا ڈیٹیچ منٹ کا شدید خطرہ ہے۔

۴۔ آپ کی بینائی خطرے میں ہے۔

۵۔ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیے لیسر بیم ٹریٹمنٹ ناگزیر ہے۔ سب کام بند کر دیجیے۔

ظاہر ہے کہ اس قولِ فیصل کا مجھ پر وہی اثر ہوا کہ جو ہونا چاہیے تھا۔ کافی دیر مَیں سناٹے میں رہا۔ بارے ہمّت سے کام لیا۔ جناب سفیرِ پاکستان جنابِ محترم صاحبزادہ یعقوب صاحب نے اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے دن کو کھانے پر بُلایا تھا۔ مسز شعیب بھی تھیں۔ یہاں مَیں نے اُن کو صورتِ حال بتادی۔ اُن کو پہلے تو حیرت ہوئی کہ مَیں ان کے ساتھ دو گھنٹے سے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کر رہا ہوں اور یہ بات نہ بتائی۔ بارے انھوں نے فوراً اپنے سفارت کے مُعالِج چشم سے رابطہ قائم کیا مگر وہ ۹ راکتوبر سے قبل وقت دے ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کو مسئلہ بتایا تو انھوں نے سبلی ہسپتال میں ڈاکٹر ریمانڈ پل کرٹین کا نام بتایا کہ وہ ریٹینا اسپیشلسٹ ہیں اور امریکا میں ان کا جواب نہیں، مگر ان سے وقت لینا ممکن نہیں ہے، مہینوں لگیں گے۔ خیر ۴ راکتوبر کو میں اپنے پتھالوجسٹ ڈاکٹر کنیڈی کے پاس گیا۔ چیک اپ کرایا۔ آخر میں ان کو میں نے آنکھ کا مسئلہ بتایا۔ وہ بھی پریشان ہوگئے۔ بارے انھوں نے ڈاکٹر پل کرٹین (PILKERTON) سے رابطہ قائم کیا، مگر ڈاکٹر کنیڈی نے بتایا کہ وہ ڈلس میں ہیں اور جمعرات کو واپسی کی توقع ہے۔ ان کی سکرٹری نے وقت دینے سے انکار کر دیا کہ ۲۹ر اکتوبر تک وہ خالی نہیں ہیں۔ امریکا میں ماہرینِ چشم سے وقت لینا بڑا ہی صبر آزما ہے۔ ۱۹۷۵ء میں میں نے دیکھا تھا کہ جناب شعیب صاحب کو ۱۷ دن بعد کا وقت ملا تھا۔ ڈاکٹر کنیڈی صاحب (پیتھالوجسٹ) کی اہلیہ اتفاق سے پل کرٹین سے واقف نکلیں، ان کو میری تکلیف کا بڑا احساس ہوا۔ خیر اُن کی جدوجہد سے بالآخر جمعہ ۷ راکتوبر کو دن کے سوا بجے کا وقت مل گیا۔ پل کرٹین صاحب نے لنچ کو خیر باد کہہ دیا۔

درمیان کے یہ چند دن میں نے اطمینان سے گزار دیے۔ نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل سائنس فاؤنڈیشن میں جو کام کرنے تھے میں نے پورے کر لیے۔ دن تو گزر جاتا تھا مگر رات بڑی سخت گزرتی تھی۔ آنکھ کا بڑا خیال تھا۔ آپ کو یاد ہے کہ مَیں نے کراچی میں اپنی اِس آنکھ کا معائنہ تین بار کرایا۔ ماہرین نے کہا: حکیم صاحب! آپ بھول جائیے کہ آپ کی آنکھ بالکل نارمل ہے، مگر میری تکلیف میرے لیے وجہِ پریشانی رہی۔

ڈاکٹر پل کرٹین نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے معائنے میں صرف کیا۔ مَیں کیا بتاؤں کہ اُن کے پاس تشخیص کے کیا کیا سامان ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ معائنے کے بعد ان کی رائے حسبِ ذیل تھی۔ میں نے ان کو ڈاکٹر براؤن کی تشخیص کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

رائے: ڈاکٹر سعید!

۱۔ آپ کا قرنیہ ڈیمیج ہو چکا ہے۔

۲- ریٹینا مجروح ہے۔ سوراخ ہے۔
۳- ڈیٹیچمنٹ کا شدید خطرہ ہے۔

میں نے کہا: کیا رائے ہے؟ فرمایا LASER BEAM TREATMENT ہی صرف علاج ہے۔

میرے سوال پر ڈاکٹر نے بتایا کہ شدید رسک لے کر زیادہ سے زیادہ ایک ماہ ملتوی کر سکتے ہیں۔ پھر یہ علاج کرانا ہی ہوگا۔ میں نے غور کیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں لیسر بیم اپریشن اور ٹریٹمنٹ کرالوں۔ سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ:

اگر کوئی حادثہ پیش نہ آگیا تو آپ اپنا سفر، پروگرام کے مطابق جاری رکھ سکیں گے۔

اگر کوئی الجھن پیدا ہوگئی تو پھر ہفتہ دو ہفتے لگ سکتے ہیں۔

طے پایا کہ آج ہی شام کو یہ علاج کر ڈالا جائے۔ ڈاکٹر پِل کرٹین کو میں نے راضی کر لیا اور پھر شام کو ۶ بجے اُن کے ساتھ سبلی ہسپتال سے جارج ٹاؤن ہسپتال چلا گیا۔ یہ وہی ہسپتال ہے کہ جہاں ۱۹۷۳ء میں ۱۴ دن میں ریڈیو آئسوٹوپ ڈویژن میں تلّی کے امتحان کے لیے آیا تھا۔ ڈاکٹر پل کرٹین اپنی موٹر میں گئے۔ مسز شعیب کو اصرار تھا کہ وہ ساتھ رہیں گی۔ ان کو میرے حال پر رونا آگیا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی پریشان تھا۔ آنکھ کا خطرہ درپیش تھا۔ میں نے مسز شعیب کو گھر بھیج دیا۔ جارج ٹاؤن ہسپتال میں جس کمرے میں میں لے جایا گیا اُس کے صدر دروازے پر DANGER لال رنگ سے لکھا تھا: THINK TWICE ظاہر ہے کہ لیسر بیم کوئی مذاق تو نہ تھا۔ وہاں سامان تیار تھا۔ ڈاکٹر پل کرٹن نے بڑی محبت سے سمجھایا کہ فلیشیز اور جھٹکے لگ سکتے ہیں۔ درد بھی ہوسکتا ہے۔ آپ اس کے لیے تیار رہیے۔ میں دل تھام کر مشین پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ہمت کا سہارا لیا۔ اب آنکھ کے سامنے مشینیں تھیں۔ سب سے پہلے CONTACT LENSE سے پُتلی کو ڈھک دیا گیا۔ یہ تجربہ نیا تھا۔ فاخرہ یاد آئی۔ سنڈوز (سوئٹزرلینڈ) میں اس نے اپنا لینس کھو دیا تھا۔ میں نے اس کو ڈانٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ آج میں یہ لینس چڑھا رہا تھا اور فاخرہ نہ تھی! کیا وہ اب تک بچی ہی ہے؟

اب مرحلہ یہ تھا کہ آس پاس جھلائی ہوگی!

یہ بڑے جان لیوا مراحل تھے۔ نہ جانے کتنے FLASHES ہوئے جو دل و دماغ کے پار ہوتے رہے۔ آدھ گھنٹہ لگا۔ ڈاکٹر پل کرٹن نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ اپنا کام کر چکے تھے، مگر میں دائیں آنکھ سے، جس میں جھال لگا تھا، دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ ایک خطرہ بھی ہوسکتا تھا۔ پل کرٹن نے مرہم لگا کر آنکھ پر پٹی چڑھا دی اور میری رپورٹ ڈکٹوفون کے اوپر رکارڈ کرادی۔ یہ

رپورٹ آپ کو ڈاک سے مل جائے گی۔ اس کو حفاظت سے رکھ لیجیے گا۔ ڈاکٹر پل کرٹن مجھے گھر لائے اور میں بستر پر لیٹ گیا۔

"—— صبح الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ بینائی کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ سات بجے صبح پٹی کھول دیجیے گا۔ مجھے بتا دیجیے گا۔ میں منتظر رہوں گا۔"

میں نے مسز ڈسلوا کو ایک غیر دفتری نوعیت کا نوٹ لکھ کر واشنگٹن سے بھجوا دیا تھا۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ میں اپنی بینائی کے خطرے سے قبل اپنے سفر کی رپورٹیں لکھ رہا ہوں اور میں نے ان کو اکثر رپورٹیں لکھ کر پہنچا دی ہیں۔ ۳ر اکتوبر سے ۷ر اکتوبر تک میں نے رات دن کام کیا، تاکہ میں اپنی دونوں آنکھوں سے ہمدرد اور پاکستان کی جو خدمت کر سکتا ہوں کر لوں۔ اور میں نے یہ خدمت کر دی ہے۔ نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ سے ہمدرد کا دائمی تعلق قائم کر دیا ہے۔ یہاں ۵ر اکتوبر ۱۹۷۷ء تک ۴۸۹۶۰ دوائی پودے جمع ہو چکے ہیں۔ ہمدرد اِس کام میں جو امداد دے گا میں نے یہ مُعاہدہ کر لیا ہے۔ تفاصیل جمع کر لی ہیں اور ماہرین کو پاکستان آنے اور دوائی پودوں پر لیکچر کرنے کی دعوت دے دی ہے۔ ڈو نے دعوت منظور کر لی ہے۔ یہ تفاصیل مسز ڈسلوا کو میں نے ۷ر اکتوبر کی صبح بھجوا دی ہیں۔ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن سے دس ٹریول گرانٹس اہلِ علم کے لیے منظور کرالی ہیں۔

میں نے یہ ہمدرد کے اور قوم کے فرائض دونوں آنکھوں سے پورے کر دیے ہیں!

رات کو ڈاکٹر پل کرٹین چلے گئے۔ ان کو میں نے ۵۰۰ ڈالر کا چیک "اپریشن" سے قبل ہی دے دیا تھا اور میری دونوں آنکھوں نے یہ منظر دیکھا۔ جب اپریشن کے بعد گھر آ رہے تھے تو ڈاکٹر پل کرین نے کہا کہ —— میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ سے چیک لے لیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ خود فزیشن ہیں! میں نے ان کو یاد دلایا کہ میں نے یہ ہدیۂ خلوص دیا ہے —— یہ چیک مسز شعیب نے دیا تھا۔ ہماری حکومت نے تو چلتے وقت ۳۲ ڈالر بھی زرِ مبادلہ نہ دیا کہ جو وہ سب کو دے دیتے ہیں —— اور پھر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انسان دیانت دار رہے۔ میں اس سفر میں کیا بھیک مانگوں گا؟ مسز شعیب چیک نہ دیتیں تو میں کیا کرتا؟

ڈاکٹر پل کرٹین چلے گئے۔ رات بھر الجھن میں گزری۔ صبح اٹھا۔ بڑی دُعائیں مانگیں۔ پھر آہستہ آہستہ لرزتے ہاتھوں پٹی کھولی۔ رُوئی کا پیڈ ہٹانے میں تامل تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے اور کیا درپیش ہے۔ خیر پیڈ اُتارا۔ ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ کھولی۔ بند کر لی۔ بالآخر بتاخ سے آنکھ کھول دی۔ بینائی بالکل صاف تھی!

اپریشن اور لیسر بیم ٹریٹمنٹ کامیاب تھا!

الحمد للہ علیٰ ذالک۔

وضو کیا۔ نماز فجر ادا کی۔ آج کی دُعا میں جو لطف آیا اور بارگاہِ ایزدی میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنے میں جو مزا آیا ۱۹۷۲ء کے اپریشن کی یاد تازہ ہو گئی!

۹ بجے میں واشنگٹن سے نیویارک روانہ ہو گیا!

آنکھ میں ہر چار گھنٹے بعد ڈراپس ڈال رہا ہوں۔

دونوں آنکھوں سے یہ خط لکھ کر آپ کو بھجوا رہا ہوں۔

کل سے کانفرنس کا کام کروں گا۔

آج رات افتتاحی تقریب ۸ بجے ہے۔

نماز مغرب ادا کر کے وہاں جاؤں گا۔

خدا حافظ۔ ہمدرد زندہ باد، پاکستان پائندہ باد

آپ کا بھائی
حکیم محمد سعید
میڈرڈ۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

۲۹ر اپریل ۱۹۷۹ء، اتوار

"آوازِ اخلاق" پر ایک کتابچہ دس ہزار چھپ کر کل آگیا تھا۔ آج میں نے اس کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اس میں ایک فارم لگایا گیا ہے کہ جو حضرات اس تحریک سے متفق ہوں وہ یہ فارم بھر کر مجھے بھجوا دیں۔ یہ کتابچہ، بلکہ کہنا چاہیے کہ تحریک "آوازِ اخلاق" کا منشور ہے۔ مَیں نے یہ منشور اپنے مریضوں کو دینا شروع کر دیا ہے۔

میری بینائی کا حال اچھا نہیں ہے۔ گو پرسوں دو ماہرین نے اطمینان دلا دیا ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ آنکھ میں کوئی بڑی خرابی ضرور پیدا ہو چکی ہے۔ طے یہ پایا کہ محترمی ڈاکٹر محمد قمر صاحب لاہور میں ماہرینِ چشم ڈاکٹر یقین صاحب اور ڈاکٹر جلیل صاحب سے رابطہ قائم کر کے بدھ کی شام میرے معائنہ چشم کا انتظام کر دیں گے۔ ڈاکٹر جلیل صاحب ریٹینا کے ماہر ہیں۔ میں آج صبح ۴ بجے حسبِ معمول اپنے ڈیسک پر آیا، مگر بصارت خراب ہے۔ غبار ہے اور صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ بہ مشکل میں نے چند کام کیے ہیں۔ اخلاق پر ایک فلم کے ڈائلاگ کو قلم لگا کر ایڈ آرٹس کو بھجوا دیا ہے اور ایک تقریر میں نے تیار

کرلی ہے۔

۶ بجے مطب ہمدرد میں آگیا اور پوری مستعدی کے ساتھ ڈیڑھ بجے تک ۱۸۲ مریضوں کو طبی مشورے دیے اور اپنے رفقا سے رخصت ہو کر ہوائی میدان آگیا۔ یہاں احترام کے ساتھ مجھے جہاز تک پہنچا دیا گیا۔ میں کارکنان کا ممنون ہوں۔ ہوائی جہاز نے کراچی سے اڑ کر ۵ بجے پشاور پہنچا دیا۔ جہاز میں کام کرتا رہا اور وقت اس طرح گزر گیا کہ پتا تک نہ چلا۔ مجھے پشاور اور راولپنڈی میں جو تقریریں کرنی ہیں ہوائی جہاز میں وہ تیار کرلی ہیں۔

۵½ بجے مطب ہمدرد پشاور میں مریضوں کی خدمت شروع کردی اور رات کے ۸½ بجے تک اپنے رفقا کے ساتھ کام کرتا رہا۔ لاہور سے امداد کے لیے جناب حکیم انوار الہٰی صاحب بھی آئے ہیں۔ ہم ۷۶ مریضوں کی خدمت کرسکے۔

حاجی گل محمد صاحب میرے دوست ہیں۔ ہم ٹوپی بدل بھائی ہیں! البیرونی انٹرنیشنل کنگرس، انٹرنیشنل کنگرس ریاضی، انٹرنیشنل کنگرس سیرت ان تینوں میں انھوں نے قبائلی علاقوں میں مندوبین کی تواضع میں تعاون کیا تھا۔ اُن کی خواہش پر میں جناب محترم امام صاحب کعبۃ اللہ کو اُن کے گھر دعوت میں لے گیا تھا۔ سارے مندوبین کو انھوں نے دعوت دی تھی اور نہ جانے کتنے دُنبے ذبح کردیے تھے! آج شب میں نے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ پُرتکلف اور پُرمحبت۔

۳۰ راپریل ۱۹۷۹ء، پیر، پشاور

شب گزشتہ حاجی گل محمد صاحب نے پُرتکلف کھانا کھلا دیا تھا۔ اس نے رات بڑی پیاس لگائی۔ میں ۱۱ بجے تو لیٹا تھا۔ پانی پینے کے لیے کئی بار اٹھا۔ بالآخر ۳½ بجے کئی گلاس پانی پی کر روزے کی نیت کرلی ہے۔ مطب کا وقت ۵ بجے صبح رکھا گیا۔ میں وقت پر مطب میں آگیا۔ مرضا بہ کثرت موجود تھے۔ سلسلۂ مطب شام کو ۴½ بجے تک جاری رہا۔ دو سو سے زیادہ مریضوں کی حتی المقدور بہترین خدمت کرکے فارغ ہوا اور ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل آگیا۔ راستے میں تین زمینوں کا مُعائنہ کیا، اور زونل منیجر ہمدرد کو ہدایت دی ہے کہ وہ کسی ایک زمین کی خریداری کریں۔ پشاور میں مطب ہمدرد کو وسعت دینی چاہیے۔ ویسے دَوا سازی کے لیے گزشتہ ماہ دو ایکڑ زمین پشاور میں علاقۂ صنعت میں خریدی جاچکی ہے اور میں نے یہ ہدایت جاری کی ہے کہ زمین کی رقم اقساط کے بجائے یک مُشت ادا کردی جائے۔

شامِ ہمدرد سے خطاب کے لیے لاہور سے پروفیسر منیر الدین چغتائی صاحب صدر شعبۂ سیاسیات جامعۂ پنجاب میری درخواست پر آئے ہیں۔ موضوع ہے "تعمیرِ ملّی میں تعلیم کا کردار"۔ صدارت میری درخواست پر محترم الحاج کفایت اللہ صاحب نے کی ہے۔

میں نے تعارفِ موضوع کے طور پر ایک مختصر تقریر کی۔ میں نے اس میں کہا کہ قیامِ پاکستان کے دوسرے روز ہمیں پاکستان کے نظام و نصابِ تعلیم کو یکسر بدل دینے کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا اور تعلیم کو اقتضائے ملّی سے مطابقت دینے اور نظریۂ حیاتِ ملّی سے ہم آہنگ کرنے کا کام شروع کر دینا چاہیے تھا، مگر ۳۱ سال گزرنے کے باوجود تعلیم کے میدان میں منزلِ مقصود ہماری نگاہوں سے آج بھی اوجھل ہے۔ میری رائے ہے کہ جنابِ صدر مجلس الحاج کفایت اللہ صاحب نے بہت صحیح بات کہی کہ اب پہلی بار پاکستان میں ایک مردِ مجاہد نے قوم کو راہِ مستقیم پر ڈالنے کا عزم کیا ہے۔ انھوں نے بڑے مناسب انداز میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی بجا تعریف کی ہے۔

پشاور سے ۸ بجے ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر ½۸ بجے میں راولپنڈی پہنچ گیا۔ ہوائی میدان پر میرے پرسنل اسسٹنٹ اور پرائیوٹ سکریٹری موٹر کے ساتھ موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بالآخر آپ کے لیے موٹر مل گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا تشکر ادا کرنا چاہیے کہ آخر کار کارکنان نے رحم کھا کر اس عاجز کے لیے ایک موٹر کار کا انتظام کر دیا ہے۔ تین ماہ میں یہ مسئلہ حل ہو سکا ہے۔ دوسرے وزیر وزارت کا قلم دان سنبھال کر دوسرے دن موٹر میں سوار ہو جایا کرتے ہیں اور ہوئے ہیں!

یہ دونوں کارکنانِ سرکاری مجھ سے متعلق متعدد سرکاری فائل میری حسبِ ہدایت لائے تھے۔ سرکاری موٹر کار کا ڈرائیور بلور خان صاحب ہے۔ ماشاء اللہ خوب بوڑھا انسان ہے۔ اس سے ہمدرد کی موٹر کے ڈرائیور نے درخواست کی کہ بھیّا ذرا آہستہ چلیو۔ وہ آہستہ چلا، مگر پھر بھی بلور خاں نے دو جگہ خطرے میں ڈالا۔ رات کے وقت اس بے چارے سے موٹر چلانی مشکل ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اچھا ہوا یہ معذور ڈرائیور مجھے دے دیا گیا۔ میں اس کا خیال و احترام زیادہ کر سکوں گا۔

میں نے رات دس بجے تک ان دونوں کے ساتھ اہم فائل دیکھے اور ان کے حوالے کر دیے۔ باقی کے فائل روک لیے ہیں۔ یہ کام میں کل شام اور رات کو کروں گا۔ میں نے فارغ ہو کر ذرا سا کھانا کھایا۔ روزہ تو پشاور میں افطار کر لیا تھا جہاں ہوائی میدان تک بلکہ جہاز میں سوار ہونے تک مریض دیکھتا رہا تھا اور بہ مشکل ایک گلاس دودھ نوشِ جان کر سکا تھا۔ روزے کے بعد یہ دودھ شاید ۱۵-۲۰ منٹ میں معدے سے غائب ہو گیا تھا۔ شدید بھوک تھی۔ کھانا اطمینان سے کھایا اور ½۱۱ بجے بستر میں لیٹے

کر اخبارات دیکھے اور پھر سو گیا۔

مطب پشاور میں ایک بڑی پیاری بچی آئی۔ عمر کوئی تین سال۔ شاید پیدائشی نابینا ہے۔ میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ میں اپنے تکلیف کے آنسو ضبط نہ کرسکا۔ بچی کا باپ بھی آبدیدہ ہوگیا۔ میں نے بڑے پیار سے بچی کو دیکھا اور اس کے لیے دوا لکھ کر اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ یہ بچی کسی طرح بینا ہو جائے۔

آج ایک مریض نے دورۂ چترال کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ چترال سے پشاور تک کا سفر جو مریض کرتے ہیں ان کی تکلیف کا خیال کیجیے اور کبھی تو چترال میں بھی مطب کرلیا کیجیے۔ کاش میں اُن کی خدمت اس طرح بھی کرسکتا۔ چترال، ہُنزہ، گلگت، سوات یہ سارے علاقے پاکستان کا حُسن ہیں۔ مگر میں نے ان میں سے ایک مقام بھی اب تک نہیں دیکھا ہے۔ اگر ان مقامات پر ادویہ کا انتظام ہو تو میں بڑی خوشی کے ساتھ ان مقامات پر مطب کرنے جانے کو آج بھی تیار ہوں۔

Printed at ZAIN PACKAGING INDUSTRIES LTD. KARACHI

حکیم محمد سعید (**ولادت**) ۹ جنوری ۱۹۲۰ء، دہلی **صدر**: ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن پاکستان؛ ہمدرد وقف: ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبّیہ؛ انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات؛ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی؛ ہمدرد اکیڈمی **رکن**: ایگزیکٹو کمیٹی انٹرنیشنل یونین آف ہیلتھ ایجوکیشن؛ انٹرنیشنل یونین برائے انسداد دق و سل **بانی**: جامعہ طبّیہ شرقیہ کراچی **محرک**: بین الاقوامی تقاریب و اجتماعات بسلسلہ ۱۵ ویں صدی ہجری **مشیر صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان** برائے طب **مصنف و مرتب**: تعلیم صحت، قلب اور صحت، ہمدرد فارماکوپیا آف ایسٹرن میڈیسن (انگریزی)؛ فارماکوگرافیا انڈیکا (انگریزی)؛ پاکستان کے افکار عصری (انگریزی)؛ میڈیسن ان چائنا (انگریزی)؛ ایمپلائر اینڈ دی ایمپلائی (انگریزی)؛ ابن الہیثم (انگریزی)؛ یورپ نامہ، جرمنی نامہ، مقالاتِ شام ہمدرد، مقالات ابن الہیثم، تذکارِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرابادین ہمدرد، کتاب الصیدنہ فی الطب (البیرونی)، عجائباتِ جسمِ انسانی، جاگو جگاؤ، تجرباتِ طبیب **مدیر اعلا**: ہمدرد صحت، ہمدرد نونہال، ہمدرد اسلامیکس (انگریزی)، ہمدرد میڈیکس (انگریزی)، اخبار الطب، میڈیکل ٹائمز (انگریزی)، یونیسکو پیامی **سیاحت علمی**: ایشیا، امریکا، آسٹریلیا، یورپ اور افریقہ کے بیشتر ممالک **مطب**: کراچی (ہفتے میں ۲ بار)، حیدرآباد، لاہور، راولپنڈی، پشاور (ماہانہ)